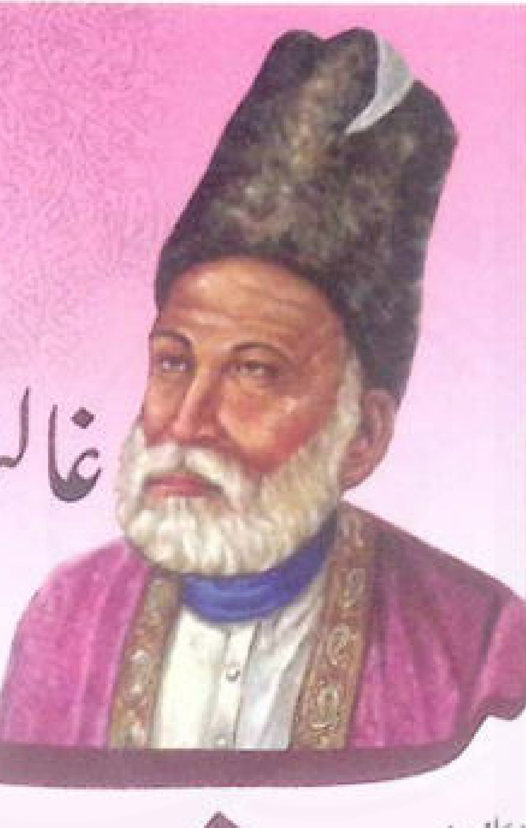
غالب

غالب ہے



مؤلف:

حضرت مولانا

محمد فخر الحسنین محمدی اعلی اللہ مقامہ

تدوین: اعتماد العلماء

مولانا محمد نذر الحسنین محمدی (ایم اے۔ فاضل عربی)

غالبؔ، غالب ہے

مؤلف:

حضرت مولانا محمد فخرالحسنین محمدی اعلیٰ اللہ مقامہ

ترتیب و پیشکش:

اعتمادالعلماء مولانا

محمد نذرالحسنین محمدی

(ایم اے۔ فاضل عربی)

نام کتاب: ________ غالبؔ، غالب ہے

مولف: ________ مولانا محمد فخر الحسنین محمدی

پیشکش: ________ مولانا محمد نذر الحسنین محمدی

تزئین: ________ مولانا محمد یعقوب شاہد آخوندی

ناشر: ________ مولانا محمد شبیر الحسنین محمدی فاؤنڈیشن پاکستان

طبع: ________ اول

طباعت: ________ فروری ۲۰۱۵ء

مطبع: ________ پرنٹ اسپوٹ

ملنے کا پتہ:

محفوظ بک ایجنسی

مارٹن روڈ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتساب

اپنے عظیم استاد، غالب ایوارڈ یافتہ، غالب شناس،
عاشق غالب، صدہا کتابوں کے مصنف ومؤلف، مفسر،
محدث، مفکر، حضرت مولانا

سیّد مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی

کے نام

جن کی تربیت کے باعث میں کچھ پڑھنے لکھنے کے لائق ہوا۔

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں......!
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں......!!

محمد فخرالحسنین محمدی

گل دستۂ عناوین

عرض ناشر:

اَلْحَمْدُ لِاَهْلِهٖ وَالصَّلٰوةُ عَلٰی اَهْلِهَا

زیر نظر مقالہ برادرِ عزیزم مولانا محمد فخر الحسنین محمدی مرحوم کے ایم۔اے اُردو کا حصہ تھا، جو مجھے اُن کی کتابوں میں دستیاب ہوا......!

مولانا مرحوم اور ان کی دینی، علمی، سماجی خدمات سے بالائی سندھ خصوصاً خیر پور کے باشندے کافی حد تک اور پنجاب اور بلوچستان کے باشندے کسی حد تک واقف ہیں، مگر ان کی شخصیت کا تعارف ایک مستقل سوانح کے لکھے جانے کا تقاضا کرتا ہے، جو انشاء اللہ مستقبل قریب میں آپ کی خدمت میں حاضر کرنے کی بھرپور کوشش کریں گے۔ اَلسَّعْیُ مِنِّیْ وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰهِ......!!

فی الحال......! یہ مقالہ آپ کی خدمت میں مولانا محمد شبیہ الحسنین محمدی فاؤنڈیشن (پاکستان) کراچی کی جانب سے پیش کیا جارہا ہے، اُمید ہے آپ کو پسند آئے گا!

اس کتاب کی تزئین کاری، کمپیوٹر کمپوزنگ اور طباعت کے مختلف مراحل کے لئے ہم اراکینِ ادارہ...... حضرت مولانا محمد یعقوب شاہد آخوندی صاحب کے شکر گزار ہیں اور نہایت ممنون ہیں......!!

صاحبانِ ذوق سے التماس ہے کہ ہماری کوتاہیوں پر ہمیں مطلع ضرور کیجئے

گا۔ ہم اپنی اصلاح کے لئے ہمہ وقت آمادہ و تیار ہیں......!! شکریہ

محمد نذر الحسنین محمدی

صدر نشین

ادارہ مولانا محمد شبیہ الحسنین محمدی فاؤنڈیشن

(پاکستان) کراچی

ابتدائیہ

عالم کائنات میں موجود جو کچھ بھی ہے فانی ہے۔ بقا کسی شے کو بھی نہیں۔ دستِ فنا ایسا شہ زور ہے کہ اس کے سامنے ہر قوی کمزور بلکہ بے بس اور بے زور ہے۔ مخلوق ارضی ہی پر منحصر نہیں، ارض و سما، پست و بالا، جن و بشر، خشک و تر، شمس و قمر، زیر و زبر، فلک و ملک، سب ہی اس دائرۂ فنا میں محصور ہیں جو ہے وہ فنا اور موت کے لئے...... یہاں تک کہ موت خود ملک الموت کے لئے آتا......! علامت ہے جانے کی، اور ہونا......! دلیل ہے نہ ہونے کی۔ بقا صرف ایک کے لئے ہے اور فنا ہر ایک کے لئے ہے......!!

انسان جب یہ دیکھتا ہے کہ فنا کے ہاتھ سے کسی طرح چھٹکارا نہیں تو ہار کر چاہتا ہے کہ میرے بعد میرا تذکرہ ہی باقی رہے......!! سمجھتا ہے کہ اولاد ہو گی تو اس سے میرا نام ونشان باقی رہے گا، لہٰذا اولاد کی آرزو کرتا ہے، لیکن افسوس کہ اس تمنا کے پورا ہونے کے بعد بھی اصل تمنا خاک میں مل جاتی ہے......! چند پشتوں کے بعد اولاد میں بھی کوئی اس کا نام ونشان تک نہیں جانتا......!!! کوئی اپنے لئے یادگار سمجھ کر باغ لگاتا ہے، کوئی عالی شان عمارت بناتا ہے، لیکن باغ ہے قلم ہونے کے لئے......! اور عمارت ہے منہدم ہونے کے لئے......! تصویریں کھنچوائی جاتی ہیں کہ ہمارے بعد، ہماری مصنوعی شکل ہی رہ جائے لیکن اصل شکل ہی نہ رہے تو یہ نقل کیا رہے گی، اور کب تک رہے گی......!! فانی کے لئے ہر یادگار فانی......!! یہ یادگاریں کچھ دنوں رہیں بھی تو برائے نام ہی رہیں، کیونکہ ان چیزوں میں صلاحیت کہاں؟ کہ مرنے والے کے وہ صفات وکمالات دکھا سکیں جو اس کی ذات میں مجتمع تھے......؟؟ ان تمام چیزوں سے بلند وبالا اور دیر پا وہ یادگار ہے جو صاحب کلام کے کلام سے وابستہ ہے۔

کلام، متکلم کے عیب و ہنر کا وہ آئینہ ہے جو متکلم کے قصد و ارادے کے بغیر خود بخود اس کی اصلی سیرت کے ہر پہلو کو نمایاں کرتا رہتا ہے۔ انسان جب تک خاموش ہے اس کے عیب و ہنر چھپے ہوتے ہیں، لیکن بولنے پر یہ پردہ چاک ہوجاتا ہے، اور عیب و ہنر جو کچھ بھی ہے، بے نقاب ہوجاتا ہے......! اسی لئے کہا گیا ہے:

تا مردے سخن نہ گفتہ باشد

عیب و ہنرش نہفتہ باشد

کلام سے محض صفات کلام ہی واضح نہیں ہوتیں بلکہ متکلم کی وہ صفات بھی واضح ہوجاتی ہیں جن کے اظہار کا متکلم کو خیال بھی نہ آیا تھا۔ کلام، متکلم کی اُن تمام صفات کا نقشہ خود بخود کھینچ دیتا ہے، جن سے کلام کا ظاہر بظاہر کوئی تعلق بھی نہ ہو۔

کلام بتا دیتا ہے کہ متکلم اس وقت مطمئن ہے یا مضطرب، پُرامید ہے یا مایوس، تندرست ہے یا بیمار، جوان ہے یا پیر، خفیف الحرکات ہے یا سنجیدہ، باہمت ہے یا بے ہمت، خود غرض ہے یا غیور، امیر ہے یا مامور، جابر ہے یا مجبور، قانع ہے یا طامع، متلون ہے یا محکم، امام ہے یا ماموم، حاکم ہے یا محکوم، خطاکار ہے یا معصوم، نیک ہے یا بد، عالم ہے یا جاہل، خالق ہے یا مخلوق......؟

غرضکہ کلام کا پڑھنے یا سننے والا اپنی صلاحیت کے مطابق متکلم کے صفات و حالات اور رازہائے دروں کا پتہ چلا سکتا ہے۔ لہٰذا صاحب کلام فانی ہو یا باقی اس کی بہترین یادگار اور اس کی صفات کا آئینہ دار اس کا کلام ہے۔ خدا کے کلام سے شانِ ربوبیت نظر آئے گی، رسولؐ کے کلام سے شانِ رسالتؐ، امام کے کلام سے شانِ امامت، ولی کے کلام سے شانِ ولایت، عالم کے کلام سے شانِ علم، اور کامل کے کلام سے شانِ کمال......!! غرضکہ

متکلم جس کیفیت اور جس حیثیت میں ہے اس کے کلام سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی صاحب نظر کسی کے کلام کو عمیق نظر سے دیکھے تو وہ متکلم کے دیکھنے سے بڑی حد تک بے نیاز ہو جاتا ہے......!!

اس سلسلے میں نظم ہو یا نثر، دونوں کا مقام بلند ہے، لیکن نثر چونکہ آسانی سے زبان زدِ خاص و عام نہیں ہو سکتی اور نظم کی طرح ایک دم دل نشین اور محفوظ نہیں ہوتی اس لئے نظم کی تاثیر و تسخیر ایک مسلّم امر ہے......!!

موجودہ زمانے میں نظم کو شاعری اور صاحب نظم کو شاعر کہا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس بنا پر کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ قرآن مجید نے تو شعر و شاعری کی مذمت کی ہے۔ لہٰذا دفع دخل کے لئے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ہر مفہوم کے لئے ہر زمانہ میں ایک ہی لفظ کا استعمال لازمی نہیں ہے۔ اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک مفہوم کے لئے ایک زمانے میں جو لفظ تھا آگے چل کر اسی مفہوم کے لئے پہلے لفظ کی جگہ دوسرے لفظ نے لے لی اور اب اس مفہوم کے لئے دوسرا لفظ بولا جانے لگا۔ مفہوم کے لئے الفاظ بھی بدلتے رہتے ہیں اور الفاظ کے لئے مفہوم بھی۔ یعنی کسی زمانے میں ایک مفہوم کے لئے کوئی لفظ اور دوسرے دور میں اسی مفہوم کے لئے کوئی دوسرا لفظ......!! مدح ہو یا مذمت، لفظ کی نہیں مفہوم کی ہوتی ہے۔ الفاظ کے لئے مفہوم اور مفہوم کے لئے الفاظ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً آج لفظ "معجزہ" عموماً استعمال کیا جاتا ہے اور اس کا مفہوم بھی ذہنوں میں موجود ہے، مسلمان معجزاتِ انبیاء کے قائل ہیں، لیکن قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال نہیں پایا جاتا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ قرآن کریم نے معجزاتِ انبیاء کا ذکر ہی نہیں کیا۔ قرآن نے اس مفہوم کے لئے لفظ "آیات و بیّنات" کہیں صیغۂ واحد اور کہیں صیغۂ جمع میں

استعمال کیا ہے۔ اسی طرح لفظ معصوم آج زباں زد ہے، اس لفظ کا مفہوم بھی ایک حد تک ذہنوں میں ہے لیکن انبیاء کا تذکرہ قرآن مجید میں جابجا ہے ان کے لئے لفظ معصوم کہیں نہیں کہا گیا۔ تو اس سے انبیاء کی نفی عصمت ہرگز نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ جو مفہوم آج لفظ معصوم کا ہے اس کے لئے قرآن کریم نے مخلصین، صادقین اور مطہرین کے الفاظ استعمال کیے ہیں......!!

شعر و شاعری کی قرآن کریم نے مذمت ضرور کی ہے، لیکن اُس وقت شعر کا مفہوم یہ نہ تھا جو، اب ہے۔ ورنہ کفار قرآن کو شعر اور نبی کو شاعر ہرگز نہ کہتے......! اُس وقت شعر کا مفہوم لغو گوئی، ہرزہ سرائی اور بے ہودہ گوئی تھا۔ خواہ وہ نثر ہی میں ہو۔ لیکن آج شعر کا مفہوم ہے: "وزنِ خاص سے کلام کو موزون کرنا۔" یہ موزوں کلام اپنے مضمون کے اعتبار سے زیادہ باخیر بھی ہو سکتا ہے اور موجب ثواب بھی اور اس کے برعکس بھی،

میں اگرچہ شاعر نہیں ہوں لیکن تھوڑا بہت ذوقِ کلام رکھتا ہوں۔ میرا یہ مقالہ شہنشاہِ اقالیم سخن حضرت مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کے حضور میں ایسے ہی ہے جیسے حضرت سلیمان علیہ السّلام کے دستِ مبارک پر ایک بے حقیقت و بے حیثیت چیونٹی......!!

معجزنما غالبؔ:

میرے نزدیک نظم کے جس قدر بھی فنون و کمالات ہیں، غالبؔ کا کلام ان سے بھرپور ہے۔ کلام کی ہر خوبی اور صنعت کو علیحدہ علیحدہ گنوانا اور دکھانا آسان نہیں ہے۔ اس وقت صرف ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ ہر کلام میں الفاظ کو مناسب ترین محل پر رکھنا یہ کلام کی وہ خوبی ہے جو حدِ کمال پر پہنچ جائے تو وہ کلام معجزہ ہے۔ اور اس کی ایک ہی مثال ہے جس کو مثالِ بے مثالی کہا جائے تو درست ہے۔ یعنی کلام اللہ جو عین کمال کا کلام ہے۔ ظاہر

ہے کہ قرآن کے لئے نئے الفاظ وضع کیے گئے جو پہلے سے عربی زبان میں موجود تھے۔ اگر قرآن کے لئے نئے الفاظ وضع کئے جاتے تو انہیں عربی مبین نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہی عربوں کے مستعملہ الفاظ جب استعمال قدرت میں آتے ہیں تو جن وانس بھی مل کر اس کی مثل نہیں لا سکتے......!! کیوں؟ اس لئے کہ عین کمال نے الفاظ کے نظم و ترتیب کو اس حدِ کمال پر پہنچا دیا جس کے بعد کمال کا یعنی تناسب ترتیب الفاظ کا درجہ ہی نہیں......!!

بہر حال یہ طے ہے کہ کلام کے حُسن، دل کشی اور تاثیر میں الفاظ کی مناسب ترتیب کو بڑا دخل ہے۔ کلام کی برتری کے لئے ضروری ہے کہ ترتیب الفاظ ایسے عنوان سے ہو کہ تصنع اور تکلف نہ ہو، اور سننے والا یہ محسوس نہ کرے کہ الفاظ کو جہاں جہاں بٹھایا ہے زبردستی اور بالجبر بٹھایا ہے۔ ایسے اشعار جن میں سادگی کے ساتھ ساتھ ترتیب الفاظ عام بول چال کے بالکل مطابق یا قریب تر ہو بہترین اشعار قرار پائیں گے، یعنی اس نظم کی نثر کی جائے تو زیادہ نظم ہی عین نثر ہو جائے اور کسی بھی لفظ کو مقدم و موخر نہ کرنا پڑے یا نظم کو نثر میں تبدیل کرنے کے لئے الفاظ میں تقدیم وتاخیر ضروری ہو تو نہایت خفیف معمولی اور غیر محسوس ہو۔

شعراء کاملین کے بعض ایسے اشعار موجود ہیں جن کو نثر میں تبدیل کرنے کے لئے الفاظ کی ترتیب کو مطلقاً بدلنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایسی مثالیں عربی، فارسی، اُردو ہر زبان میں موجود ہیں۔ چنانچہ بڑا مشہور و معروف قطعہ ہے:

بلغ العلیٰ بکمالہ   کشف الدجیٰ بجمالہ
حسُنَت جمیع خصالہ   صلوا علیہ وآلہ

عربی زبان ہونے کی وجہ سے ہم اس کلام کی پوری خوبی نہیں سمجھتے۔ اس نظم میں مخصوص کمال یہ ہے کہ اس کو نثر میں تبدیل کرنے میں کسی ایک حرف کو بھی اِدھر اُدھر کرنے کی

ضرورت نہیں ہے، جو لفظ جہاں ہے وہ بغیر تکلف کے قواعد کے لحاظ سے اپنے اصل مقام پر ہے۔ لہٰذا جو نظم ہے وہی اس کی نثر ہے۔ غالبؔ کے اکثر اشعار کے الفاظ کی ترتیب کے لئے بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے......!!

چند شعر مثالاً ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ ہر لفظ اپنی جگہ موزوں، برمحل اور جڑا ہوا ہے۔ ترتیب الفاظ میں تبدیلی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا:

بوئے گل، نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا؟
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا؟

یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہئے!

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا!!

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

گو ہاتھ میں جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر ومینا مرے آگے!!

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے!!

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

عشق نے غالبؔ نکما کردیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام؟
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں......!

کلام غالب کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ اس کا حیرت انگیز تنوع ہے، جسے ڈاکٹر عبدالرحمن نے نہایت نفیس طریقے سے بیان کیا ہے......! لوح سے تحت تک مشکل سے سو (۱۰۰) صفحے ہیں۔ لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں؟ کون سا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں؟ غالب کی شاعری بظاہر زیادہ تر عشق و محبت کا بیان ہے۔ لیکن منطق کے لئے اس شاعری میں دلائل و براہین بھی موجود ہیں۔ شگفتہ طبع لوگوں کے لئے شوخی اور ظرافت اور انسانی فطرت کی داستان پسند کرنے والوں کے لئے ایسی نصیحت کہ چشمِ بصیرت وا ہو جائے......! یہی وجہ ہے کہ دیوانِ غالب میں ہر شخص اپنی تصویر دیکھتا ہے اور لطف اٹھاتا ہے......!

اُردو ادب میں پہلی بھرپور اور رنگا رنگ شخصیت غالب کی ہے۔ ان سے پہلے کئی شاعروں کی شخصیت قابلِ توجہ ہے مگر کسی میں اتنی رعنائی اور رنگینی نہیں ہے۔ حالی نے اسی لئے "یادگارِ غالب" میں ان کی جامعیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اسی شخصیت کے اثر سے اِن کی شاعری تہ دار اور پہلو دار ہے۔

مجموعۂ اضدادِ غالب:

غالب کی زندگی کے عام واقعات، ان کے خطوط اور اشعار کا مطالعہ کریں تو

غالبؔ کی بھرپور اور پہلودار شخصیت کو پوری طرح گرفت میں لینا مشکل ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بظاہر...... غالبؔ کی شخصیت مجموعۂ اضداد ہے۔ یہ شخصیت ضبط اور برہمی، غم اور مسرت، لگاؤ اور بے نیازی محبت اور نفرت، خوشامد اور خودداری ان سب کیفیات ورجحانات کی آئینہ دار ہے۔ اس میں کونپل کی سی لچک، چٹان کی سی سختی اور پارے کی سی بے قراری ہے۔ اور یہ تمام باتیں مختلف بلکہ متضاد کیفیات کی غماز ہیں۔ چنانچہ اس مطالعہ سے مجموعی تاثر یہی ملتا ہے کہ غالبؔ ایک محشر خیال اور مجموعۂ اضداد ہے......!!

لیکن...... حقیقت یہ ہے کہ اگر مزید غور کریں تو صاف محسوس ہونے لگتا ہے کہ غالبؔ کی شخصیت ایک مرتب اور مدوّن شخصیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو میں غالب کی شخصیت کو پہلی بھرپور اور جاندار شخصیت کہا جاتا ہے، جس کا ہر پہلو اور ہر گوشہ ہمارے لئے دلچسپی اور لطف کا سامان رکھتا ہے۔ ان کی رومانیت، تجربات اور کیفیات کی نئی نئی فضاؤں میں لے جاتی ہے اور ان کا تنقیدی شعور اس میں کلاسیکی نظم وضبط پیدا کر دیتا ہے۔ ان کی انانیت میں انفرادیت کی بہاریں بھی ہیں اور کیف و انبساط کا سامان بھی ہے۔ ان کی شاعری میں فکر کا گہرا سرمایہ ہے جو شاعرانہ لطافتوں کے ساتھ سمو دیا گیا ہے۔ ان کا فلسفیانہ مزاج اور حکیمانہ شعور ہمیں زندگی کو سمجھنے اور اس کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے اور اس طرح وہ زندگی کی ایک اہم خدمت انجام دیتے ہیں......!!

تفکر اور تفلسف، شاعری کے لئے ناگزیر اور ضروری نہیں ہے۔ لیکن جب شاعر فلسفے کو شعر اور شعر کو فلسفہ بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس میں وزن اور بلندی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعری میں فلسفہ کے جلوہ گر ہونے کی مختلف صورتیں ہیں۔ کبھی

شاعر کا کلام صاف طور پر ایک نظامِ فکر کا حامل ہوتا ہے۔ کبھی اس کے خیالات کے تانے بانے سے ایک نظامِ فکر ترتیب دیا جاسکتا ہے اور کبھی فلسفہ سے مراد حیات و کائنات کے بارے میں چند ایسی باتوں یا کسی ایسے زاویہ نگاہ سے ہوتی ہے جس میں فلسفیانہ عمق اور گہرائی پائی جاتی ہے۔

غالبؔ کے کلام کی فلسفیانہ حیثیت کے بارے میں اُردو تنقید میں مختلف بلکہ متضاد رائیں دی گئی ہیں...... ! کوئی کہتا ہے کہ غالب کا ایک فلسفہ ہے...... ! کوئی کہتا ہے ان کا کوئی فلسفہ نہیں...... !! کسی کو وہ قنوطی معلوم ہوتے ہیں اور کسی کو رجائی...... !!

فلسفی غالبؔ:

غالبؔ کے متعلق اتنی متضاد رائیں دیکھنے کے بعد ان کے کلام کو غور سے پڑھنے اور صحیح رائے قائم کرنے کی ضرورت جس قدر بڑھ جاتی ہے وہ ظاہر ہے۔

غالبؔ، فلسفی شاعروں کے اس زمرے میں نہیں آتے۔ جن کا کلام صاف طور پر ایک نظام فکر کا حامل ہوتا ہے۔ فلسفہ کی شاعری میں ایک نظام فکر کا حامل ہوتا ہے۔ فلسفہ کی شاعری میں ایک نظام فکر پیش کرنے کی شعوری کوشش ہوتی ہے۔ غالبؔ کی شاعری کا مقصد نہ تو اس مفہوم میں فلسفہ طرازی تھا اور نہ انہوں نے کہیں اس کا دعویٰ کیا ہے...... !!

غالب ایک غزل گو شاعر تھے۔ اور غزل بنیادی طور پر داخلی جذبات اور عدم تسلسل کی شاعری ہے۔ اور جذبات کی دنیا کس قدر انقلاب آگیں ہوتی ہے۔ یہ سب جانتے ہیں۔ بہر حال غالب ایک فلسفیانہ مزاج رکھتے تھے۔ ان کا ذہن ہر بات کی تہہ تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ حقیقت کے ادراک، اس کی قدر و قیمت کے تعین اور تحلیل و تجزیے سے

انہیں خاص دلچسپی تھی۔ اس اعتبار سے ان کے نزدیک کائنات کے وجود اور معشوق نے بہت دنوں کے تغافل کے بعد ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی ہے۔ دیکھئے غالبؔ اس کا تجزیہ کس طرح کرتے ہیں......:

بہت دنوں سے تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اِک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے......!!

غالب کا یہی مزاج تھا جو انہیں فلسفیانہ موضوعات اور فلسفیانہ انداز نظر کی طرف کھینچتا رہا۔ اُنہوں نے اپنے کلام میں جا بجا خدا کی ہستی، حیات و کائنات کی حقیقت اور مادّہ اور روح کے متعلق پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس میں وزن بھی ہے اور گہرائی بھی، اور چونکہ وہ اپنی بڑھی ہوئی انانیت، زمانہ کی ناقدری اور ذاتی محرومیوں کے باوجود، زندگی کے دھارے سے الگ نہیں ہوئے۔ اس لئے اُنہوں نے اپنے فکری سرمائے سے وہ کام لیا جس سے زیادہ کا ان کے زمانے میں تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

غالبؔ کے یہاں فنا اور جبر کے مضامین ہیں اور بعض خاص مواقع پر اُنہوں نے موت کی دُعائیں بھی مانگی ہیں لیکن اس کے باوجود انسان کی عظمت، زندگی سے لگاؤ اور کائنات کے ایک کلی تصور کی سحر کاری انہیں وقتاً فوقتاً خیال و فکر کی ان بلندیوں تک لے گئی۔ جہاں تک اُردو کا کوئی شاعر اُن کا تعاقب نہیں کر سکتا......!!

چند اشعار لائق ملاحظہ ہیں:

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں!!

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب؟
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا، پایا

منظر اِک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا، کاش کہ مکاں اپنا

غالبؔ کے کلام کی جن فکری بنیادوں کی طرف اشارہ کیا گیا ان سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ غالبؔ کے فلسفہ کو قنوطیت اور رجائیت کے خانوں میں نہیں بانٹا جا سکتا، فلسفیانہ مفہوم سے قطع نظر کر کے قنوطیت اور رجائیت کا تعلق افتادِ طبع سے سمجھا جاتا ہے اور یہاں بھی نا اُمیدی اور، اُمید، اور غم و خوشی کی ایک میکانکی تقسیم روا رکھی جاتی ہے، غالبؔ اس معاملے میں واقعیت پسند تھے۔

یوں تو کسی بھی شاعر کو قنوطی یا رجائی نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ ہر شاعر کے یہاں بالعموم متضاد کیفیتوں کا اظہار ملتا ہے اور ایک ہی غزل کے مختلف شعروں میں کبھی وہ ہنستا ہوا نظر آئے گا اور کبھی روتا ہوا، اور کبھی دونوں کیفیتوں سے عاری، بایں ہمہ کسی بھی شاعر پر کسی خاص حکم کا اطلاق اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم مجموعی طور اس کے تمام کلام کا مطالعہ نہ کر لیں اور اس کی شاعری کے گرد و پیش کی فضا کو اچھی طرح نہ سمجھ لیں۔

غریبِ شہر غالبؔ:

غالب کو پڑھیئے! اس کی تصویر آپ کے سامنے ایسے مظلوم پیکر کی ہوگی جو اپنی بے بسی اور حرماں نصیبی کی خود ہی مثال ہو غالبؔ مظلوم ہے۔ مجبور ہے۔ مجبور ہے اور اس حد تک کہ تلخیوں، ناکامیوں اور نامرادیوں کی گہری شکنیں اس کی پیشانی پر ابھری ہوئی نظر

آتی ہے۔اس کی روح کی افسردگی نوکِ قلم سے ٹپک کر صفحۂ قرطاس پر کچھ اس انداز سے بکھری نظر آتی ہے کہ اس کے کلام کا بیشتر حصہ حسرت والم اور بے کسی و مجبوری کا دلگداز مرقع بن گیا ہے، دیکھئے! دیوان کی ابتداہی "فریاد" سے ہورہی ہے۔

"نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا"

معلوم ہوتا ہے کہ خود غالب کی مغموم روح کاغذی پیرہن میں ڈھل گئی ہے اور مجسم فریاد بنی فضا میں سرگرداں ہے۔

شاعر کے ذاتی حالات اور اس کے ماحول کا اثر اس کے کلام پر ضرور پڑتا ہے کہ اس لئے کہ شاعری قلبی محسوسات اور اور دلی تاثرات کے اظہار ہی کا نام ہے، یہ ممکن نہیں ہے کہ شاعر کا دل ودماغ ان کیفیات سے متاثر نہ ہو جن کے نقوش گردوپیش کی فضا اس پر مرتسم کرتی رہتی ہے۔اس کلیہ پر غور کرنے کے بعد جب ہم غالبؔ کے حالات زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں خود بخود حقیقت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ابتدا سے آخر تک، ولادت سے وفات تک غالبؔ ہمارے سامنے ایک ایسے مظلوم و بے کس فرد کی صورت منصہ شہود پر ابھرتے ہیں جن پر قسمت اپنی ہر ممکن ستم ظریفی آزماتی ہے......!

پیدا ہوتے ہی یتیم ہوجاتے ہیں اور پانچ برس کی عمر تک چچا کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں۔چچا کے انتقال کے بعد ننھیال والوں کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھتے ہیں، جہاں شباب کو پہنچتے پہنچتے ازدواجی زندگی کی زنجیر میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ ننھیال میں کچھ دن ضرور سکھ چین کے ساتھ بسر ہوتے ہیں لیکن یتیمی بے مائگی اور بے چارگی کا احساس آخر تک پیچھا نہیں چھوڑتا۔غالب کا شباب آمدنی کا فقدان مصارف کی زیادتی اور خانگی جھگڑوں کی روز افزوں مصیبتوں میں پلتا ہے......! جوانی کی وہ قیمتی

گھڑیاں جب انسان اپنی صلاحیتوں اور عزم وطاقت کے بل بوتے پر خوش آئند اور سنہری مستقبل کی بنیادیں استوار کرتا ہے۔ فکر معاش اور نانِ شبینہ کی تلاش میں گزر جاتی ہے اور اپنے پیچھے تلخیوں، ناکامیوں اور محرومیوں کا ایک طویل اور لامتناہی سلسلہ چھوڑ جاتی ہے جن میں محبوبہ کی موت بھی ہے، بھائی کا جنون بھی، عزیز واقربا کی بے مہری بھی ہے اور ہم چشموں کی بے مروتی بھی......!!

بچپن کے بعد سوگوار جوانی بھی بیتی۔ اور "بڑھاپا کیا آیا، بُرا آپا آیا" اور اپنے ساتھ دکھوں اور تکلیفوں کا ایسا انبوہ سمیٹ کر لایا جس نے غالب کو وقت سے پہلے ہی زندہ درگور کر دیا۔ ایام پیری میں جنگ آزادی کی صعوبتیں، اقارب کا قتل، عارف کی موت، پنشن کا بند ہو جانا، جاگیر کی تباہی، ادبی مخاصمتیں کہاں تک گنوایا جائے......؟!!

مصیبتوں اور تکلیفوں کا آسمان ان کے سر پر ٹوٹ پڑا، انہی سے نبرد آزما ہوتے ہوتے نذر اجل ہو گئے......! لیکن اُردو شاعری کو ہمیشہ کے لئے زندگی بخش گئے اور خود بھی اسی عہد کے کلام کی بدولت زندہ اور جاوداں ہے۔

غالب کی حزنیہ شاعری ان کے ماحول کی سوگواری اور حالات کی ناسازگاری کا لازمی نتیجہ تھی......! اپنے زمانے میں ان کی وہ قدر نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے......! بہت سے لوگ ان کی شاعری کو سراسر الہام سمجھتے، اور بعض دیگر بے معنی اور محض بکواس...... حتیٰ کہ انہیں برہان قاطع کی تصنیف سے پہلے کہنا پڑا

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا......!
نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی......!

اس ناسپاسی و ناقدری کی وجوہ کچھ بھی رہی ہوں، غالب کو اس کا شدید احساس

تھا اس لئے وہ کہتے ہیں:

بیا ورید گر اینجا بود زباندانے

غریب شہر سخنہای گفتنی دارد

ذرا "غریب شہر" کی ترکیب اور "گفتنی دارد" کی بے بسی پر غور فرمایئے، کون سا دل ہوگا جو ان صورت حالات پر تڑپ نہ اٹھے گا......!!!

غالبؔ حوادث زمانہ سے بری طرح متاثر ہوئے اور زمانے نے انہیں دیا بھی کیا تھا! مسلسل احساس محرومی مسلسل اضطراب و نا آسودگی، رنج وغم، حسرت والم، پھر کیسے ممکن تھا کہ اُن کے کلام پر رنج وغم کی گہری پرچھائیاں نظر نہ آئیں...... چنانچہ کہتے ہیں:

آگ سے پانی میں بجھتے وقت، اٹھتی ہے صدا

ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

خموشی میں نہاں، خوں گشتہ، لاکھوں آرزوئیں ہیں

چراغ مردہ ہوں میں بے زباں گور غریباں کا......!

جسے نصیب ہو روز سیاہ، میرا سا

وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو؟!!

جہان میں غم و شادی بہم، ہمیں کیا کام؟؟

خدا نے ہم کو دیا ہے وہ دل کہ شاد نہیں

یہی پرچھائیاں جب مزید گہری ہو جاتی ہیں تو بڑی واضح تصویر سامنے آتی ہے

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغ جگر ہدیہ
مبارک باد اسدؔ غم خوار جانِ درد مند آیا

احساس بے چارگی اور شکست خوردگی کی یہ تصویریں غالبؔ کے کلام میں جا بجا ملتی ہیں۔ خصوصاً مشہور قطعات، "ظلمت کدے میں، میرے شب غم کا جوش ہے!"۔ اور "رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو!"۔ میں جن کا ہر شعر حسرت والم کی بھرپور اور دردناک کہانی معلوم ہوتا ہے۔

غالب کا ذاتی حزن وغم جب ارتقائی مدارج طے کرتا ہے تو اس میں آفاقیت اور ہمہ گیری آجاتی ہے۔ غالب کی شاعرانہ صلاحیتوں کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے درد کی کسک کو دوسرے کے دل میں اس طرح سمو دیتا ہے کہ قاری کو اس کا ہر زخم اپنا گھاؤ نظر آتا ہے......! قدرت خیال اور بلندی افکار کی بدولت غالب قنوطیت ایسی شے کو بھی رفعت عطا کر دیتا ہے۔ یہی غالب کی عجیب وغریب انفرادیت اور شخصیت کا راز ہے...... دیکھیے عاشق کے لئے غم کو کس قدر ضروری خیال کرتے ہیں......!

غم، آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

یا پھر......!

تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن
چشمِ وا گردیدہ، آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

غالبؔ کی یہی شان انفرادیت ہے...... جس نے انہیں اُردو شعراء میں ایک ممتاز مقام عطا کیا ہے۔ ان کا غم ایک مجبور اور بے کس انسان کا غم ہے۔ جس کی زندگی کا ہر لمحہ تقریباً عالم نزع میں ہی گزرتا ہے، لیکن اس کی نگاہ تماشا گاہ ہستی کی وسعتوں کا شدید احساس رکھتی ہے۔ زندگی کے دکھ درد کا احساس رکھتے ہوئے بھی اگر وہ عملی طور پر نہ سہی تو کم از کم ذہنی طور پر اس سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش ضرور کرتے ہیں......!!

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ......!
دیکھیں کیا گزرے ہیں قطرے پہ گہر ہونے تک!!

لیکن کسی تعمیری نقطۂ نظر کی عدم موجودگی میں فقط فکر و احساس ہی کے سہارے آسودگی حاصل کرنے کی کوشش کو "سعیِ لاحاصل" کے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے؟ اس لئے کہ اگر صرف احساس ہی سے کام چل جاتا تو بہت ممکن تھا کہ غالب کی شاعری کا دوسرا پہلو ہی زیر بحث رہتا...... لیکن دنیا جانتی ہے کہ جگنو کی چمک اور بجلی کی کڑک سے ظلمت کدہ میں اجالا نہیں ہو سکتا...... خیالات و احساسات کے نازک شیشے زندگی کی تلخ حقیقتوں سے ٹکرا کر اس طرح ٹوٹ جاتے ہیں کہ خود آئینہ گر کو بھی زخمی کر ڈالتے ہیں...... یہی کیفیت غالبؔ کی بھی ہے جہاں ان کی ہر آرزو ماحول کی گود میں سسک سسک کر زندگی کی دہلیز پر دم توڑ دیتی ہے...... اور وہ اس "آئینۂ تمثال دار" کی شکستگی پر نوحہ خواں رہ جاتے ہیں...... غالبؔ کی حساس طبیعت اپنی ناکامی اور بدنصیبی پر فرطِ غم سے کراہ اٹھتی ہے اور ان کا اعتبار ہستی میں نذرِ فراوانیٔ حالات ہو جاتا ہے......!

حنائے پائے خزاں ہے، بہار اگر ہے یہی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

بزم قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ
صیدِ ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا

یہی وہ مقام ہے جہاں غالبؔ کا نظریہ غم ایک خصوصیت اختیار کر لیتا ہے، لیکن ہم میں سے کتنے لوگ اس حقیقت کی وجہ جانتے ہیں اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ غالبؔ کی مجروح اور شکستہ دل کی دُکھ بھری آواز ہے، جس کی تفسیر انہوں نے ان الفاظ میں بھی کی ہے کہ مندرجہ ذیل اشعار سے ان کے دُکھ کا اندازہ ہوتا ہے......!

نام کا میرے ہے وہ دُکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

وہ حالات کس قدر حسرت ناک اور پُر درد ہوں گے جن کے تحت غالبؔ نے اس قسم کے اشعار کہے۔ غالبؔ دُکھیا اور بے کس تھے انہوں نے جب اپنے ماحول پر نگاہ ڈالی تو انہیں رنج و محن کی امنڈتی ہوئی گھنگھور گھٹاؤں کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آیا...... ایسے حالات میں اگر انہوں نے خود کو دنیا کا سب سے بدنصیب اور بے بس انسان سمجھا تو کچھ بھی غلط نہ تھا......!!

اگر رنج اور مصیبت کی گھڑیوں میں کسی شناسا کی صورت نظر آ جائے یا ہمدرد اور مخلص دوستوں کی رفاقت میسر آ جائے تو بڑی حد تک کلفتوں اور صعوبتوں میں کمی ہو جاتی ہے...... اور احساسِ سوگواری و مجبوری کچھ دھیما پڑ جاتا ہے، لیکن غالبؔ کی بدنصیبی یہ ہے

کہ انہیں جیتے جی ایسا کوئی ساتھی نہ ملا اور ملا بھی تو وہ جلد ساتھ چھوڑ گیا...... عارف اور نواب شمس الدین کی بے وقت موت اور مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ سایہ ظفر سے محرومی کچھ ایسے ہوش رُبا سانحات تھے جنہوں نے ان کی متاع صبر اور جینے کے آخری وسیلے کو بھی چھین لیا۔ انہوں نے مرنا چاہا لیکن مر نہ سکے...... اور حد یہ ہے کہ کسی سے اپنی محرومیٔ قسمت کی شکایت بھی نہ کر سکے وہ زندہ رہے کہ زندہ رہنے پر مجبور تھے مگر زندہ دلوں کی طرح نہیں بلکہ مرنے کی آرزو میں جینے والوں کی طرح گھٹ گھٹ کے درج ذیل اشعار سے ان کی مجبوری گھٹن اور شدید کرب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے......!

لب خشک در تشنگی مردگاں کا
زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا
ہمہ ناامیدی ہمہ بدگمانی
میں دل ہوں فریب وفا خوردگاں کا

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

ہم سب جانتے ہیں کہ دنیا ایک تماشا گاہ ہے...... رنج و مسرت اور حسرت و شادمانی کے ہنگاموں سے بھرپور ہر فرد ان میں سے اپنے مقسوم کی چیزیں چن لیتا ہے...... کسی کی زندگی مسرت و شادمانی سے بھرپور ہوتی ہے، اور کسی کے حصے میں فقط رنج و محن ہی آتے ہیں...... غالب کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہیں عمر بھر محرومیوں کے علاوہ کچھ نہیں ملتا......!!

؎ حاصلِ الفت نہ دیکھا جُز شکستِ آرزو!!

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ در خورِ محفل نہیں رہا
دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

غالبؔ اس ناسازگاری ماحول کے باوجود اس جہانِ آب وگل میں زندہ رہنے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارتے ہیں......اپنی سی ہر کوشش کرتے ہیں، کہیں بے کاری جنون میں سر پیٹنے کو شغل سمجھ کر اور کہیں خود فریبی کی بنا پر رنج کا خوگر ظاہر کر کے......لیکن ان کی کوئی پیش نہیں چلتی، بد قسمتی ان کی ہر کمزور کوشش کو بے دردی سے پامال کرتی چلی جاتی ہے...... غالبؔ کی شاعری کی ساری فضا پر انہی حزینہ اور غمگین ارتعاشات کی دبیز چادر پھیلی ہوئی نظر آتی ہے......اسی غم نے ان کی دل فریب شخصیت کی نوک پلک کو سنوارا ہے

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

ہاں ملا دے دشت کو اے وسعتِ شوقِ جنون
ہے بہت کم اپنے کاشانے کی ویرانی مجھے

اور کہیں کہیں غالبؔ کی ایذا پسندی واعظانہ رنگ بھی اختیار کر لیتی ہے......!

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

اہل بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج، کم از سیلئ استاد نہیں

حسرت پرست غالبؔ:

اہل بینش اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ غالب کی فطری شگفتگی اور بذلہ سنجی کو حوادث زمانہ نے مسخ کر دیا ہے...... اور ان کی ہستی میں بھی تلخیوں کا طوفان چھپا ہوا ہے اور ان کے قہقہوں کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی ہیں...... دیکھئے مندرجہ ذیل اشعار بھی غالب کی قنوطیت کی دلیل ہیں......!

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر بھی میرا رنگ زرد تھا

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ظلمتِ شب کا گماں ہونے لگتا ہے، اُردو شاعری میں اس کیفیت کے امام، میرؔ

کے بعد غالبؔ ہیں جو نغمۂ شادی اور نوحۂ غم میں کوئی فرق بھی محسوس نہیں کرتے، بلکہ ہر نغمۂ شادی کو کسی نہ کسی نوحہ یا غم کا پیش خیمہ سمجھ کر خاموش بیٹھے رہ جاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

یہ سوچ جب اپنی ارتقائی صورت اختیار کر لیتی ہے تو کبھی کبھی اس کا دامن رجائیت سے بھی چھونے لگتا ہے......!!

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیٔ آزادی
ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

اسی نظریے کے تحت کسی نے کہا تھا کہ یہ تو درست ہے کہ پھولوں کا تصور کانٹوں کے بغیر محال ہے لیکن دنیا میں ایسے ہزاروں کانٹے ہیں جنھیں پھولوں سے دور کی بھی نسبت نہیں...... غالبؔ کا کلام بھی اسی قنوطیت سے مملو ہے......!! دیکھئے غالبؔ نے انتہائے مایوسی میں خود اپنی مایوسی کا کتنے حسین انداز میں مذاق اُڑایا ہے......

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

واحسرتا! کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

دیوانِ غالبؔ کے اوراق ہر نوجوان نے زندگی کے ہر موڑ پر کبھی افسردگی کے ساتھ کبھی اشتیاق اور کبھی حسرت کے ساتھ ضرور الٹے ہوں گے...... غالبؔ نے ہم میں اکثر کی زندگی کی رفاقت کی ہے...... وہ کبھی بے تکلف ساتھی کی طرح ہماری حسرتوں میں شریک ہوئے ہیں...... کبھی ایک روشن دماغ ہمدرد کی طرح شادابی اور شگفتگی لے کر ہماری صحبتوں میں آئے ہیں اور کبھی ہماری آہوں اور آنسوؤں میں غم خواری کرتے رہتے ہیں......

آخر کیا وجہ ہے کہ ہمارے دل کا درد غالبؔ کے کلام میں صدائے بازگشت پاتا رہا ہے، یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ ہم اپنے اندر حال سے بے اطمینانی، مستقبل کی آرزو مندی اور زندگی کے بارے میں ایک شگفتہ تشکیک کا وہی جذبہ پاتے ہیں جو غالبؔ کے کلام میں بار بار جھلک اٹھتا ہے...... غالب کا عہد ایک عظیم تہذیب کا اختتام تھا، ایک تہذیب تہی دامن ہو کر بیٹھ گئی تھی، اور دوسری تہذیب کا کارواں ہنوز نمودار نہ ہوا تھا...... پرانی قدروں سے بے زاری عام تھی اور نئی قدریں ابھی وضع نہیں ہوئی تھیں، اس عمرانی خلا میں غالبؔ کا وجود ایک نقشِ فریادی کی طرح اُبھرتا ہے اور ناکردہ گناہوں کی داد طلب کرتا ہے، آج کا دور بھی اسی قسم کے ایک تمدنی دوراہے پر پہنچ گیا ہے......!!

آخر ان ناکردہ گناہوں کی حقیقت کیا ہے، یہ ناکردہ گناہ وہی حسرتیں تو ہیں جنہیں تکمیل کی سعادت نصیب نہیں ہوئی، زمانے نے ان کی صورتیں مسخ کر دیں اور یہ شخصیت کا ایک ضروری جزو ہو کر بری طرح کھلی گئیں...... غالبؔ کی حسرت اور آرزومندی مریض اور عیاش طبع نہیں، نہ انہیں داغؔ کی شوخی اور عیاش طبعی کی داد دینا ہے اور نہ جرأتؔ و انشاءؔ کی طبیعت سے واسطہ ہے...... یہ ایک صحت مند ذہن اور زندگی کی خوبصورت چیزوں

سے محبت رکھنے والے کی حسرت ہے، انہیں زندگی سے حسرتوں سمیت پیار ہے...... غالبؔ کی حسرت پرستی بے پایاں ہے......!!

دل نہیں، تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

کبھی تو اس سر شوریدہ کی بھی داد ملے
کہ ایک عمر سے حسرت پرست بالیں ہے

دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا

حسرت کا لفظ جس قدر غالبؔ کے یہاں ملتا ہے اتنا کسی دوسرے شاعر کے ہاں نہیں ملتا، اگر ان کی حسرتوں کا تجزیہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حسرتیں ایک شاندار جاگیرانہ دور کے پس منظر میں نمو پذیر ہوئی تھیں...... انہوں نے ہمیشہ فریدوں کے خاندان کے ہونے پر فخر کیا...... ان کا بچپن اگرا آگرے میں جاگیردارانہ ماحول میں گزرا لیکن ان کا زمانہ وہ تھا جب یہ نظام تہ و بالا ہو رہا تھا اور انہیں مطلوبہ آدرش نہیں دے سکتا تھا اسی لئے غالبؔ کے شکوۂ بخت پر لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ مرزا اپنی زندگی میں اعزاز و احترام پانے کے باوجود، نارسائی بخت کے شاکی ہیں......!! بادشاہ کے استاد ہونے پر بھی ان کی طبیعت آسودہ نہیں ہوتی، دراصل یہ ناآسودگی غالبؔ کا تصنع اور تکلف نہیں...... ان کے شوق کی بلندی کا اشارہ ہے...... انہوں نے زمانے سے جو کچھ مانگا وہ بہت تھا، ماضی کی

بساط تہہ ہو چکی تھی لیکن ماضی کی عظیم آدرش ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئے تھے وہ صاحب نظر جمالیاتی کی طرح صرف درجہ اوّل کی چیزوں پر ہی قناعت کر سکتے تھے، درجۂ دوم کی چیزوں سے سمجھوتہ کرنا ان کے لئے ممکن نہ تھا...... غالبؔ نے ماضی کا ذکر ہمیشہ شدت جذبات کے ساتھ کیا ہے......!!

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا؟

وہ فراق اور وہ وصال کہاں؟
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں؟

غالبؔ ماضی کی ان تابندہ روایات کو تلاش کرتے ہیں...... مگر زمانے کا انقلاب انہیں بھی مسمار کر دیتا ہے، وہ نظام جس نے انہیں تصورات بخشے تھے، جس نے ان کا آئینہ خانہ سجایا تھا، مٹ رہا تھا۔ ان کا آرزوؤں سے پامال وجود، حال کی ستم ظریفی کے خلاف ایک متوازن احتجاج ہے۔ وہ شکست آرزو سے نالہ بجاں ہیں، انہوں نے آرزوؤں کی شکست وریخت کا یہ نظارہ بڑے اضطراب اور کرب کے ساتھ دیکھا ہے۔

دائم الحبس اس میں ہے لاکھوں تمنائیں اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو ماتم خانہ ہم......!!

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو
دل بدل پیوست گویا اک لبِ افسوس تھا

غالبؔ حسرت پرست ہیں۔ ان کے غم واندوہ کی بنیادی خصوصیت یہی حسرت پرستی ہے وہ ناکام ہو کر اُداس اور افسردہ تو ہو سکتے ہیں لیکن اسی اداسی اور افسردگی پر قناعت نہیں کر سکتے......وہ غم آشنا تو ضرور ہیں، مگر غم پرست نہیں ہیں، ان کی نگاہیں سیہ خانوں کی محرم تو ہیں، لیکن سیہ خانوں کی مکین نہیں ہیں۔ انہیں شکستِ آرزو کا یہ تماشا کرب و اضطراب کے لیے سبق سکھاتا ہے لیکن وہ غم کے آگے سپر نہیں ڈالتے کبھی شوخی اور زندہ دلی سے ان تاریکیوں کو بھی روشن کر دیتے ہیں، ایک جگہ میر مہدی کو لکھتے ہیں:

"میاں! بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آ گیا ہے، اس طرف سے خاطر جمع رکھنا، رمضان کا مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹا، آگے خدا رازق ہے، کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے......!!"

ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

غالبؔ نے غم کو گوارا ہی نہیں کیا ہے بلکہ اسے زندگی کا ایک بنیادی عنصر تسلیم کیا ہے......فرق یہ ہے کہ میر نے اسے زندگی بنا لیا تھا غالبؔ اسے فقط جز سمجھتے رہے، شکستِ آرزو پر بھی ان کی خطر پسند اور حسرت پرست طبیعت نے سپر نہیں ڈالی......دیکھیے وہ کیا کہتے ہیں......!!

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟؟

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک......!!

یہ آرزومندی اور حسرت پرستی کا کھیل غالبؔ نے جس زندہ دلی اور مردانگی سے کھیلا ہے وہ انہیں جدید نسل کے ذہنی اور جذباتی آہنگ سے بہت قریب کرتا ہے، وہ تمناؤں کے رنگ محل سجاتے ہیں، ان آئینہ خانوں کی شکست پر آنسو بہاتے ہیں، لیکن اس کے ٹوٹ جانے پر زندگی کے ولولے اور آرزومندی کے جذبے سے دامن کش نہیں ہوتے، انہیں معلوم ہے کہ زندگی حسرتوں کا احترام نہیں کرتی، لیکن حسرتوں کی لذت انہیں عزیز ہے......زندگی سے اس قدر گہری محبت اور غم کا اس قدر متوازن احساس اُردو شاعری میں کہیں نہیں ملے گا......!!

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں؟
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے......!!

نہ لائے شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

جلتا ہے جی کہ کیوں نہ ہم اِک بار جل گئے
اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار...... حیف!!

زندگی کی حسرتوں میں غالب نے جو تابناکی ڈھونڈی ہے، جو حسرت پرستی شعار کی ہے اور ناکامیوں اور نامرادیوں کے باوجود آرزومندی کی جو شمعیں جلائی ہیں، انہیں کی وجہ سے وہ اپنے دور کی فکر سے علیحدہ اور ممتاز نظر آتے ہیں...... غالبؔ نے زندگی سے محبت کی ہے، اس کے کانٹوں کو چُنا ہے...... اس کے کرب و اضطراب سے اپنے پہلو کو گرمایا ہے...... لیکن خلش اور آرزومندی کی شاداب اور صحت مند آگ سے ان کا سینہ ہمیشہ آباد رہا ہے......!!

سراپا رہنِ عشق و ناگزیر الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

مفکّر غالبؔ:

غالبؔ ایک مفکّر شاعر تھے، انہوں نے زندگی کے نشیب و فراز کو بڑے عمدہ طریقے سے ظاہر کیا ہے، ولی سے لے کر غالب تک جو رنگ تھا غالبؔ نے اسے بالکل بدل دیا......!

غالبؔ فارسیت کے دلدادہ تھے، ان کے پیش نظر بیدلؔ اور عرفیؔ تھے۔ باقی شعراء پر ولیؔ کا رنگ غالب تھا...... یہ شعرائے اردو ولیؔ کے رنگ سے آگے نہ بڑھ سکے، اور کسی جدت کی طرف مائل نہ ہوئے...... یہی وجہ ہے کہ غالبؔ کی شاعری میں تنوع اور ہمہ گیری ہے...... یہ تو ظاہر ہے کہ غالبؔ نے شاعری کی ابتدا بیدلؔ کے رنگ میں کی تھی...... لیکن عرفیؔ اور طالب آملی کی فیضان کی وجہ سے انہیں اپنی شاعری کا رنگ بدلنا

پڑا، ورنہ تو وہ کہہ چکے تھے......!

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خان قیامت ہے!

بعد میں غالبؔ نے اپنے ذاتی اجتہاد کی بنا پر بیدل اور دوسرے خیال بند شعراء کی پیروی ترک کردی تھی، لیکن وہ اپنی اولین عقیدت کو بالکل ہی فراموش نہ کرسکے...... پہلے دور سے آگے بڑھ کر بھی غالبؔ کے دل میں بیدلؔ کی عقیدت برقرار رہی...... غالبؔ کی پختگی کے زمانے کا ایک مشہور شعر ہے......!!

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا!!؟؟

دورِ اول میں جو پیچیدگی غالبؔ کے کلام میں نظر آتی ہے، اسکی ایک وجہ وہ فلسفیانہ موشگافی ہے جو بیدلؔ کی پیروی میں لازمی تھی، اسی فلسفیانہ رمز شناسی کی بنا پر غالبؔ اور بیدل دونوں اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھتے تھے، دونوں کو ہم رنگ دیکھئے:

قطرۂ ما تا کجا سامان خودداری کند
بحر ہم از موج ایں جا می شمارد دام ہا
(بیدلؔ)

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہیں قطرے پہ گہر ہونے تک
(غالبؔ)

غالبؔ کی فطرت میں ایک رومانی کیفیت موجود ہے، جسے غالبؔ

خود بینی، آزادی، یا آزادہ روی کہتے ہیں...... یہ شخصی غرور اور طاقت کا وہ احساس ہے، جو مکروہات و مصائب کو خاطر میں نہیں لاتا، اور ناکامیوں کو حقارت سے ٹھکرانے کی کوشش کرتا ہے......!

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا......!!

بقول حالیؔ، مرزا کے کلام کی چار خصوصیتیں نمایاں ہیں......

۱۔ جدت مضامین اور ایسی تشبیہوں کا استعمال جو نہ صرف نئی تھیں بلکہ اظہار مطالب کے لئے نہایت مناسب تھیں......!

۲۔ استعارہ اور کنائے کا استعمال۔

۳۔ شوخی و ظرافت

۴۔ ایسے اشعار کی کثرت جن کے ایک سے زیادہ معنیٰ مراد لئے جا سکتے ہیں۔

غالبؔ کے کلام کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اشعار سے وہی لوگ لطف اٹھا سکتے ہیں جو خود بھی قوتِ متخیلہ سے بہرہ مند ہوں۔

ابتدائی دور میں غالب شعریت کی طرف اتنے متوجہ نہ تھے جتنے عجیب و غریب خیالات اور دور از کار تشبیہوں کی طرف۔ انسانی فطرت سے واقفیت جو ان کے آخری کلام کا طرۂ امتیاز ہے، ابتدائی دور میں مفقود ہے۔ ابتدائی دور میں ظرافت کی چاشنی بھی نہیں ملتی، تصوف کے اشعار بھی رکی ہیں...... آگرہ سے دلی آنے کے بعد یہ ابتدائی طرز ترک ہوتا گیا...... دوسرے دور میں طبیعت کا اصلی رنگ نظر آتا ہے، تشبیہات فطری ہیں، اظہار خیال میں خلوص ہے، عرفی معاملہ بندی میں استاد سمجھا جاتا ہے، لیکن غالب کی نظر عرفی سے

بھی زیادہ وسیع تھی......!

غالبؔ کے یہاں الفاظ، اظہار مطلب کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ ان سے شاعرانہ خوبی پیدا کرنا مقصود تھا، الفاظ کے انتخاب ہم آہنگی اور نشست میں غالبؔ کا کوئی ہم پلہ نہیں۔ وہ الفاظ کو اس طریقے سے ترتیب دیتے تھے کہ ان کا ترنم اور ان کی ہم آہنگی پُر لطف ہو جاتی تھی۔ فارسی ترکیبیں غالبؔ نے ضرور استعمال کی ہیں......لیکن یہ خیال کہ فارسی تراکیب سے تغزل کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے درست نہیں ہے......

غالبؔ کے چوتھے دور کی خصوصیت شوخی اور ظرافت ہے۔ جوں جوں انہوں نے اپنی طبیعت کو عقل کے ماتحت کیا، ان کے اشعار میں شگفتگی آتی گئی......

غالبؔ کی شاعری میں اگرچہ زیادہ تر عشق و محبت کا بیان ہے، لیکن منطقی کے لئے دلائل و براہین بھی موجود ہیں، اور شگفتہ طبع لوگوں کے لئے شوخی و ظرافت بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص ان کے کلام سے لطف اٹھاتا ہے۔ ہر قسم کے انسان کے لئے خواہ وہ مے خوار ہو یا محتسب، ظرافت کا متلاشی ہو یا غم زدہ، عاشقانہ مزاج کا مالک ہو یا فلسفی، غالبؔ کے کلام میں کچھ نہ کچھ مطلب کی باتیں مل ہی جاتی ہیں......!!!

غالبؔ نئے طرز کے انسان تھے۔ تقلید کو پسند نہ کرتے تھے، ان کی جدت پسندی نئی تشبیہوں اور نئے مضامین تک محدود نہ تھیں بلکہ فن شعر، خطوط نویسی اور دوسری باتوں میں بھی وہ اپنے معاصرین سے بہت آگے ہیں......!

جدت پسند غالبؔ:

اُردو غزل میں غالبؔ جدتِ ادا کے امام ہیں......!! میرؔ اور مومنؔ بھی لفظوں پر قدرت رکھتے ہیں، لیکن غالبؔ انہیں فاتحانہ انداز میں استعمال کرتے ہیں......ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ جن لفظوں کو وہ برت رہے ہیں گویا انہی کے لئے بنے ہیں......!!

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ
شعرِ خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

میر کو اُستادِ سُخن ماننے کے باوجود غالب کو خود بھی اپنی خوش ادائی کا احساس تھا، اور وہ جانتے تھے کہ جو حُسنِ ادا ان کے کلام میں ہے وہ کسی اور شاعر کے یہاں موجود نہیں ہے......!!

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

اُردو میں رمزی اور ایمائی اندازِ بیاں غالب کی غزل میں اپنے کمال کو پہنچا ہے، لہٰذا ذوق کی رنگی معاملہ نگاری اور صنعت گری کی داد دینے والوں کے لئے یقیناً غالبؔ کا کلام سمجھنا دشوار ہوا ہوگا، چنانچہ انہی لوگوں کی بدذوقی کو دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا!

یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

شاعر کے تخیل میں اگر واقعی قوت اور جان ہے، تو وہ نہ صرف اپنے زمانے کو بلکہ آنے والے دور کو بھی متاثر کرے گا۔ غالبؔ کے کلام پر یہ بات ہو بہو صادق آتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعرانہ بصیرت سے اس کی پیش گوئی کردی تھی......

کو کبہ را در عدم اوج قبولے بودہ است

شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

بیدلؔ کے تتبع کا زمانہ بہت جلد ختم ہو گیا اور مرزاؔ نے اپنے بیان کی ندرت اور تخئیل کی جدت کے لئے اپنا علیحدہ طرز ایجاد کیا جو انہی کے لئے مخصوص ہو رہا۔ اس طرز نے مرزا کو بھی اُردو زبان کا بے مثل اور کامل شاعر بنا دیا......!

حکیم نکتہ داں غالبؔ:

غالبؔ صرف شاعر نہ تھے بلکہ حکیم نکتہ داں بھی تھے، انہوں نے غزل میں حکمت و فلسفہ کو بڑی خوبی سے سمو دیا ہے اور اس طرح زندگی کی بصیرتوں میں اضافہ کیا۔ غالبؔ کی ان غزلوں کو بھی جن میں کوئی مشکل لفظ نہیں آتا، ہر ایک نہیں سمجھ سکتا، انہیں سمجھنے کے لئے ایک خاص قسم کا ذوق اور علمی بصیرت درکار ہے۔ جس کی کاوش کے بغیر رموز و معانی بے نقاب نہیں ہو سکتے۔ غالبؔ کی غزل اُردو زبان میں رمز نگاری کا آخری نقطہ ہے۔ ان کے سہل ممتنع کی ایمائی کارفرمائیوں میں بھی رموز و معانی کی گہرائی برقرار رہی ہے۔ اس لئے کہ ان کے تخئیل کی پرواز کا اندازہ ہی نرالا اور اچھوتا تھا۔ انہوں نے عامیانہ خیالات اور مبتذل محاوروں سے احتراز کیا۔ تاہم رعایت لفظی سے اپنے کلام کے حُسن کو دوبالا کیا......!

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز

پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اس غزل کے ہر شعر میں لفظی اور معنوی رعایت موجود ہے۔ مگر تصنع نام کو نہیں۔ ہر لفظ اپنا مقام رکھتا ہے اور کس خوبی کے ساتھ رمز و کنایہ سے ہم آہنگ ہے۔ پوری غزل ایمائی تاثیر میں رچی ہوئی ہے......! روانی کا یہ عالم کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لفظ معانی کے لئے اور معانی لفظوں کے لئے بنے ہیں......! ان اشعار میں کوئی لفظ مشکل نہیں اس کے باوجود غالب کے اچھوتے طرزِ ادا نے معمولی لفظوں کو بے پناہ تاثیر، قوت اور وسعت عطا کر دی ہے......!

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

غالبؔ کے لہجے کی متانت، لفظوں اور بندشوں کی موزونیت اور اثر آفرینی دلوں کو لبھاتی ہے اور انسان حیرت میں پڑ جاتا ہے کہ سیدھے سادے لفظوں میں یہ تاثیر کہاں سے آ گئی......؟ غالبؔ کے یہاں جذبے، فکر اور تخیل کا ایسا حسین امتزاج موجود ہے کہ اُردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں اس کی نظیر نہیں ملتی......! غزلوں میں چھوٹی بڑی سب بحریں استعمال کی ہیں......لیکن کہیں بھی موسیقیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا کہ شعر کا

جادو اسی سے جگایا جاتا ہے......!!

غالبؔ کے طرزِ فکر و تخیل دونوں، جذبے سے ہم آہنگ ہیں اور ان کے کلام میں شعر کے یہ تینوں عناصر اسی خوبی سے ایک دوسرے میں مدغم ہیں کہ ان کا علیحدہ وجود باقی نہ رہے۔ ان کی آمیزش سے ایک مخصوص طلسمی فضا پیدا ہوگئی ہے...... جو غزل پر چھا جاتی ہے اسے ہم محسوس تو کر سکتے ہیں لیکن اس کا منطقی تجزیہ نہیں کر سکتے...... یہ ان کی قادر کلامی کا اعجاز ہے کہ انہوں نے ان شعری عناصر کو اپنی منشا کے مطابق جس طرح چاہا ڈھالا اور ان سے اپنی مرضی کے نقوش ثبت کیے۔ اسی لیے ان کے ہر شعر میں ان کے طرزِ ادا کی جلوہ گری نظر آتی ہے جو ان کی شاعرانہ شخصیت کی آئینہ دار ہے......!!

حُسن و عشق کی داستان سرائی میں غالبؔ نے تصنع سے احتراز کیا۔ صنائع بدائع ویسے بھی ان کے کلام میں کم ملتے ہیں اگر کہیں کوئی صنعت یا رعایت آ گئی ہے تو وہ بالکل فطری معلوم ہوتی ہے اور ذوق کہیں بھی انگشت نمائی نہیں کرتا۔ حُسن و عشق کے تمام پہلوؤں پر غالب کی نگاہ پڑی۔ چنانچہ کہیں عجز و نیاز کا اظہار ہے تو کہیں دامنِ محبوب کو حریفانہ کھینچنے کی دعوت ہے......!!

• عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو آج اس کے حریفانہ کھینچیے

ایک اور مقام پر محبوب کے دامن کو کھینچنے کا ذکر کرتے ہوئے اپنے گریبان کی طرف بھی بلیغ اشارہ کر جاتے ہیں اور خود بالکل معصوم بن کر اپنے ہاتھوں کو برا بھلا کہتے ہیں کہ انہیں کسی طرح کا فرق نہیں پڑتا......!

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو، کبھی جاناں کے دامن کو!

نالوں میں اثر ہو یا نہ ہو لیکن ایک لگاؤ ہمیشہ باقی رہنا چاہیے، محبت نہیں تو عداوت ہی سہی......دیکھیے کس سادگی و پرکاری سے مطلب ادا کرتے ہیں......!!

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی!
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے!
بے نیازی تری عادت ہی سہی!

غالبؔ کے کلام کا بیشتر حصہ مجاز کا رنگ لیے ہوئے ہے۔اس مجاز سے حقیقت کا دامن لٹکا ہوا ہے۔یہ بھی رمز نگاروں کا کمال ہے کہ قاری اور سامع حقیقت ومجاز کے دونوں پہلو اپنے مزاج کی کیفیت کے مطابق ڈھونڈ نکالے اور اس سے لطف اندوز ہو۔دیکھیے غالبؔ کے اِس شعر کا اطلاق حقیقت اور مجاز دونوں پر ہو سکتا ہے، جس طرح بھی اسے سمجھیے لطف میں کوئی کمی نہیں آتی......!!

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں!

غالبؔ کی اس ہمہ گیری میں ہی اس کی عظمت مضمر ہے......!بعض مرتبہ نہایت واضح طور پر مجاز ہی سے گفتگو کی ہے۔اس میں کھینچ تان کے حقیقت کے پہلو نکالنا ذوقِ سلیم کے لیے گراں ہے۔تاہم آپ اِن میں عریانی یا ابتذال کا نشان تک نہ پائیں گے......!ملاحظہ کیجیے!

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں......!!؟

کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز......؟

غالبؔ کی واقعہ نگاری کے چند شعر ملاحظہ ہوں جن کی خوش ادائی اور بلاغت جتنا ناز کرے کم ہے......!!

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے......!!

ہجر و انتظار کی کیفیات، شعراء کا ایک عام اور پیش پا افتادہ مضمون ہے، جسے غالبؔ نے ندرت بیان اور حُسنِ ادا سے بالکل نرالے پیرائے میں پیش کیا ہے......!

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں......!

قاصد کے آتے آتے خط اِک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں......!!

ایک جگہ غالبؔ نے حیا اور خواہش اظہار کی کشمکش کو بیان کرتے ہوئے عجیب و غریب مضمون پیدا کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شرم ایک ادائے ناز ہے۔ اور ہر ادا کے لئے ضروری ہے کہ وہ ظہور میں آئے ،لہٰذا شرم و حجاب خود بے حجابی کا موجب بن جاتے ہیں......!!

شرم اِک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

غالبؔ کے طرز ادا میں بلا کی شوخ نگاری ملتی ہے،جس کی نظیر اُردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ہے۔ یہ شوخی عشقیہ مضامین تک محدود نہیں ہے بلکہ دوسرے مسائل کے متعلق بھی ہماری بصیرتوں میں اضافہ کرتی ہے......!غالبؔ کی شوخی کا معیار بہت بلند ہے اوران کے طرز ادا نے اس بلندی میں خاص دل کشی پیدا کر دی ہے......!

میں نے کہا کہ بزم ناز غیر سے چاہیے تہی
سُن کر ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں......!

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا......؟؟

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

رندانہ مضامین میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ متانت اور سنجیدگی کو بھی قائم رکھا ہے......!! اس طرح شعر کی نزاکت اور باریکی مزید اجاگر ہو جاتی ہے اور ذوق، لطف اندوز ہوتا ہے......!

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

کہاں مے خانے کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ!!
پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے!!

غالبؔ کے حکیمانہ انداز کے اشعار میں بھی طرز ادا کی جدت ہے۔ انہوں نے تغزل کی خوبیوں کو قائم رکھا۔ ورنہ یہی مضمون بالکل روکھے پھیکے ہو جاتے۔ ان کے کلام

میں واعظانہ مقدمات نہیں ملتے، البتہ حکمت واخلاق کے مسائل کو رمز وایما کی زبان میں ادا کیا ہے......!!

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

غالبؔ کے کلام کی اصل خوبی کے طرز ادا کی جدت اور انوکھا پن ہے۔ اگر انہیں معمولی بات بھی کہنا ہو تو اپنے خاص رنگ میں کہتے ہیں جو جذبے کی تاثیر اور خیال کی دلکشی میں رچا ہوا ہوتا ہے......انہوں نے الفاظ کی بندش اور تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال میں، عام ڈگر سے ہٹ کر اپنی علیحدہ راہ اختیار کی ہے، اور ضرورت کے وقت لفظی ومعنوی تصرف سے بھی کام لیا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے اسلوب بیان کے خود موجد ہیں۔ ان کے مضامین اور استعاروں کا اچھوتا پن اُن کی شاعرانہ بصیرت پر دلالت کرتا ہے......بعض جگہ قدماء کے مضمون میں تعجب انگیز نزاکتیں پیدا کر دی ہیں۔ اصل میں کوئی مضمون کسی کی ملکیت نہیں ہوتا، جو اس کو دل نشیں انداز میں باندھ دے اسی کا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ غالبؔ نے جب بھی دوسرے اساتذہ کے مضمون مستعار لیے تو ان میں اپنے بیان کے پیرائے سے ضرور کوئی جدت پیدا کی ہے۔ سعدی کا مشہور شعر ہے:

یا وفا خود نبود در عالم
یا مگر کس دریں زمانہ نکرد

اسی مضمون کو غالبؔ نے حسنِ ادا سے بلند کر دیا:

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

حافظ کہتے ہیں:

آفریں بردل نرم تو از بہر ثواب
کشتۂ غمزدۂ خود را بہ نماز آمدۂ

غالبؔ نے تھوڑے سے تصرّف سے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے:

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا......!

بلاشبہ غالبؔ کا شعر حافظؔ کے شعر سے بڑھ گیا ہے...... "زود پشیماں" کی ترکیب میں ایک جہانِ معنی پوشیدہ ہے اور اس لفظ میں طنز کس غضب کا ہے، جسے محسوس کیا جا سکتا ہے، بیان نہیں کیا جا سکتا۔

میرؔ کہتے ہیں:

سراہا ان نے ترا ہاتھ جن نے دیکھا زخم
شہید ہوں میں تری تیغ کے لگانے کا......!

میرؔ کے شعر میں کنائے کی رمزی کیفیت اتنی نمایاں نہیں ہوئی جتنی کہ نفسِ واقعہ کی نوعیت۔ اسی مضمون کو غالبؔ نے تھوڑی سی تبدیلی سے زیادہ بلیغ اور پُر لطف بنا دیا:

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں؟؟

جو بات میرؔ نے تفصیلاً بیان کی تھی، غالبؔ نے اجمال سے وہی کام لیا اور بڑی خوبی یہ پیدا کی کہ استفہام اور سوال کے ذریعے رمزی کیفیت اجاگر کردی۔

طرزِ ادا کی جدت اور انوکھے پن کی ایسی مثالیں اُردو شاعروں میں غالبؔ کے سوا کسی اور کے یہاں نہیں ملتیں......!

میں! اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں......!
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا......؟!

متجسس غالبؔ:

تجسس اور تفحص، انسانی طبیعت کا خاصہ ہے...... یہ ایک ایسا عمل ہے جو مسلمہ عقائد و نظریات کے تار و پود بکھیر دیتا ہے اور نو دریافت حقائق کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس کی خلقت میں ایک قسم کی بے تعلقی اور آزادہ روی شامل ہے، اور یوں بظاہر یہ ایک غیر سنجیدہ اور بے مقصد سا رجحان ہے، لیکن غور کیجیے تو انسانی زندگی کے عظیم ترین مقاصد کا شدید احساس اسی سے ابھرتا ہے...... اور زندگی کی برفیلی فضاؤں میں حرارت کا چمکتا ہوا سورج اسی سے طلوع ہوتا ہے...... یہ خصوصیت انسان سے اس کا بڑھاپا اور جوانی کا اندھا پن چھین لیتی ہے اور وہ معصومیت عطا کرتی ہے جو کسی بھی فکری تعصب یا جذباتی خودسری سے وابستہ نہیں ہونے دیتی...... اور یوں زندگی کے اندر تنوع اور ہماہمی کو جنم دیتی ہے اور اغلباً پوری اُردو شاعری میں اس کی واحد مثال، طبعِ غالبؔ اور ان کی شاعری ہے......!

غالب طبعی طور پر ایک متجسس شخصیت رکھتے تھے، وہ ہر رنگ اور ہر روپ اپنا کر اُس کی ماہیت سے متعارف ہونا چاہتے تھے......! اسی لیے وہ کہیں شوخی کا سوا رنگ

رچا کر معتقدات پر چوٹیں کرتے تو کہیں سنجیدگی کا بہروپ بھر کر فلسفیانہ افکار کے پُرشکوہ محلات میں جا پہنچے......!! شراب خانے سے جھومتے جھامتے نکلتے تو زاہد سے چھیڑ چھاڑ کرتے اور صوفی کے حجرے میں جا گھستے تو بغل میں شراب کی بوتل لیے رہتے اور کہیں بھی قیام نہ کرتے اس لئے کہ ان کی متجسس طبیعت کسی ایک جگہ کی پابند ہو کر نہیں رہ سکتی تھی......!!

ان کی متجسس طبیعت نے انسانی زندگی کے اندر بت شکنی کے عمل کو جہاں بطور خاص دیکھا ہے وہاں وہ اس بات سے بھی غافل نہیں کہ انسانی عقل و خرد، انتہائی طور پر منفرد ہوتے ہوئے بھی مروّجہ اندازِ فکر سے بے تعلق نہیں رہ سکتی اور حقیقت شناسی کا یہ کمال کہ وہ دوگونہ پن جس پر انسان کی فکری زندگی کا دارومدار ہے اس کی تفہیم اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ تجسس خالص اور گہرانہ ہو اور متجسس نگاہ، انکشافِ حقیقت کے سلسلے میں بچے کی طرح کسی بھی قسم کے ذہنی تعصبات سے آلودہ نہ ہو......!! شاید حقیقت کے اسی احساس کے تحت غالبؔ نے کہا:

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو......!

تنگ نظری، انسانی طبیعتوں کو مرجھا دیتی ہے، اور مشاہدے کی فراوانی اس کا ازالہ کرتی ہے......!! یہ حقیقت ایک نفسیاتی تجزیہ ہے اور جس موثر انداز سے غالبؔ نے اسے پیش کیا ہے، اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اس حقیقت کو بذاتِ خود محسوس کیا ہے۔ سنی سنائی یا قیاسی باتوں سے متاثر ہو کر اس کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ ان کی بیدار شخصیت نے زندگی کے تلخ ترین لمحات میں سے اسے ڈھونڈ نکالا ہے اور شعری قالب

میں ڈھالا ہے......!!

لیکن یہ نفسیاتی حقیقت کسی ایک مخصوص ذہن سے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت عمومی ہے......اور اس کا تعلق تمام انسانوں کی نفسیات سے ہے، لیکن اس حقیقت کو اس ڈھب سے پہچان لینا اور پھر گرفت میں لے آنا یہ فقط ان انسانوں کا وصف ہے جو محض اپنی ذات کے خول میں سمٹے ہوئے نہیں رہتے بلکہ باہر نکل کر انسانوں کی اجتماعی زندگیوں کا جائزہ بھی لیتے ہیں......!!

ہر لحظہ بیدار رہنے والی نظر جب انسانوں کی اجتماعی زندگی کے حلقے کو توڑ کر باہر نکلتی ہے تو اس کا سابقہ اپنے اردگرد پھیلے ہوئے مناظر قدرت سے پڑتا ہے اور یوں اس کا دامن ہر قسم کے تصویری پیکروں سے بھرا رہتا ہے......جس طرح ماں کی گود میں آنکھ کھولنے والا بچہ بڑا ہو کر گھر سے باہر کی پھیلی ہوئی وسیع کائنات کے رنگارنگ نظاروں کی دلکشی کو محسوس کرتا ہے اور ان کے سمیٹنے کی کوشش میں اپنی نمو دگی سے حرکت و عمل کے بے شمار پیکر تراش لیتا ہے اور یہ پیکر جاندار معنویت کے حامل ہوتے ہیں......بالکل اسی طرح غالب کی شاعری کا جزو غالب تخلیق ہوا ہے......!!

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا!

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے......!

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں......!!

باطنی کیفیات وواردات کی بے نام ونمود دنیا کو خارجی دنیا کے تصویری پیکروں میں پیش کرنا فنکارانہ خلاقی کے بغیر ممکن نہیں ہے اور اسی سے پتہ چلتا ہے کہ غالبؔ نہ صرف اپنی ذات کی اتھاہ گہرائیوں اور پیچیدگیوں پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں بلکہ ان کی بصری حس نے ان دونوں دنیاؤں کے اس ملاپ سے ایک تیسری دنیا تخلیق کر سکے کہ داخلی اور خارجی دنیاؤں کے اس ملاپ سے جو تیسری دنیا وجود پا سکتی ہے وہ غالبؔ کی اپنی دنیا ہے......ان کی خلاق شخصیت نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے خمیر سے اسے بنایا ہے اور یہ دنیا اس تجسس کی مرہون منت ہے جو بچے کے اندر خالص حالت میں موجود ہوتا ہے......اور اس کی وجہ سے وہ کسی چیز کو جس شکل میں دیکھتا ہے اسی طرح قبول نہیں کرتا، بلکہ اس کے تانے بانے بکھیر کر اس کی کنہ اور حقیقت کو دریافت کرتا ہے......اور نئے سرے سے ترتیب دے کر نئی شے تخلیق کرتا ہے اور یہی فنکار کی اپنی تخلیق ہوتی ہے......اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ فن میں اس کی داد ودہش کیا ہے؟ اس حقیقت کا اظہار غالبؔ نے یوں کیا ہے......!

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

ماہر نفسیات غالبؔ:

غالبؔ کے زمانے میں انسانی نفسیات کوئی باقاعدہ موضوع نہ تھا لیکن اس کے باوجود حیرت ہوتی ہے کہ انسانوں کی نفسیات کے وہ پہلو جن سے ان کے ردِ عمل متعین ہوتے ہیں اور جو بنیادی حیثیت رکھتے ہیں ان کی نظر سے پوشیدہ نہ تھے......! یہ طرز عمل

تجزیاتی ذہن کی نشاندہی کرتا ہے......! اور کہنا پڑتا ہے کہ انسانی نفسیات سے واقفیت کا یہ عالم اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا جب تک کسی انسان کے اندر اپنی ذات کو اپنے آپ سے الگ رکھ کر دیکھنے کی عادت نہ ہو......!! جب تک ایک جراح کی طرح وہ اپنی ذات کو چیر پھاڑ کر اسے سمجھنے کا حوصلہ نہ رکھتا ہو......!

ہوئی مدت کہ غالبؔ مرگیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا!؟

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا......؟؟

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی......!
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا؟

دنیا میں ایسا کون سا انسان ہے جسے اپنی ذات سے محبت نہیں ہوتی۔ احساسِ ذات اور اس کے معنوی وجود کی تلاش انسان کے اس ابتدائی زمانے کی یاد دلاتی ہے جبکہ وہ اپنے اور اپنے اردگرد چلتے پھرتے انسانوں، کائنات اور مظاہر کائنات کے باہمی فرق کو محسوس کرنے لگتا ہے اور اس کا تجسس اس کی اپنی ذات کے ہر عمل کو اس کی نگاہوں کے سامنے عریاں حالت میں پیش کرتا ہے تا کہ اپنی ذات کی پہچان سے وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھ لے اور فطرت کے رحم وکرم پر زندہ رہنے کے بجائے وہ اپنے بازوؤں کی توانائی پر بھروسہ کرے اور خود اختیاری، ازل سے لازم وملزوم ہیں۔ وہ شخص جسے اپنا لہو گرما کر

زندہ رہنے کی عادت ہو، حرکی کیفیات کا مظہر ہوتا ہے۔ غالبؔ کی شاعری میں جو حرکی کیفیات ملتی ہیں اس کی وجہ عرفانِ ذات ہی کی خصوصیت ہے......!!

شرح اسباب گرفتاریٔ خاطر مت پوچھ......!
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا!

مجبوری و دعوائے گرفتاری الفت
دست تہ سنگ آمدہ پیمان وفا ہے!

ہنگامۂ زبونی ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

جب کوئی شخص اپنی ذات اور اس کی کنہہ کو سمجھنے لگتا ہے تو اس کے اندر اپنی ذات اسے ماورا، کائنات کے اس بیکراں سلسلے کو سمجھنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے اور یہ اُمنگ اس کے دائرۂ تجسس کو پھیلا دیتی ہے اور وہ ان سوالات کو اٹھاتا ہے جو ذات اور کائنات پر محیط ہوتے ہیں......!! اور یوں اس کا فکری دائرۂ عمل اس کے اپنے وجود سے لے کر کائنات کے بے کراں سلسلوں تک پھیل جاتا ہے......!!

غالبؔ نے بھی کچھ اس طرح، اپنی ذات کی حدود پھلانگ کر کائنات کے اس وسیع و عریض سلسلے کو سمجھنے کی کوشش کی ہے......!!

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی......!!
ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی!

ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ،صبا آوارہ،گُل نا آشنا

تجسس کی سادہ اور بے رنگ کیفیت کے ساتھ سفر کرنے والا جب اپنے اور کائنات کے درمیانی فاصلوں کو طے کرتا ہے تو اس کی نگاہ کا دامن متنوع حقائق سے بھر جاتا ہے اور بصیرت کا یہ کمال اس کی شخصیت کی عظمت کا جائز احساس اس کے اندر پیدا کر دیتا ہے اور وہ احساس کی پہاڑ ایسی بلندی پر بیٹھا ہوا جب اپنے چاروں طرف نظر دوڑاتا ہے تو بجا طور پر پکار اُٹھتا ہے......!!

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے!
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے!
اِک کھیل ہے اَورنگِ سلیماں مرے نزدیک!
اِک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے!
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے آگے!
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے!

لیکن اگر اس دانش مند بزرگ کے سینے میں ہمکتا ہوا تجسس کا بچہ اپنی تر و تازگی اور معصومیت کو قائم رکھے ہوئے ہے تو وہ اپنی شخصی بلندی کی ان چوٹیوں سے بھی اوپر اُٹھنے کی کوشش کرتا ہے جن تک وہ پہنچ چکا ہے اور اس حالت میں بے اختیار پکار اُٹھتا ہے......!!

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے بزمِ امکاں کو ایک نقشِ پا ،پایا

جو شخص اپنی نگاہ سے کام لینے کا عادی ہو وہ سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتا۔ روایت کے احترام کے باوجود روایت کو علیٰ حالہ قبول کرنا اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا......!! وہ مسلّمات اور معتقدات کی چھان پھٹک کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ غالب کی سیمابی اور نت نئے حقائق کی ٹوہ میں رہنے والی شخصیت کچھ اسی نوعیت کے پس منظر میں اظہار خیال کرتی ہے......!!

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن، اسدؔ!
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

عشق و مزدوریِٔ عشرت گہِ خسرو کیا، خوب
ہم کو تسلیم، نکونامیِٔ فرہاد نہیں......!!

غالبؔ نے اپنے اشعار میں فرہاد اور منصور حلاج کی شخصیتوں کو کبھی آئیڈیل تسلیم نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ تو ان کا وہی تجزیاتی رویہ ہے جو ہر شے کو اپنے زاویے سے پرکھنے کی کوشش کرتا ہے......اور دوسری وجہ ان کے کردار کی یہ خوبی کہ وہ کسی کی شخصی عظمت یا اجتماعی دباؤ سے مرعوب نہیں ہوتے بلکہ اپنے اخذ کردہ نتائج کی روشنی میں فیصلہ کرتے ہیں......اور اس کا بے خوف و خطر اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ فرہاد سے انہیں یہ شکایت ہے کہ اس کا عشق بے لوث نہ تھا......اور منصور کے متعلق ان کا خیال ہے کہ اس کا اعلان محض اس کی بے حوصلگی کی وجہ سے تھا......!!

غالب کی اس رائے کی ایک اور وجہ بھی ہے، اور وہ ہے غالب کی اپنی حرکی

شخصیت کے مطالبات فرہاد کی انفعالیت اور منصور کی بے حوصلگی میں اسے زندگی کی بے لاگ اور رواں دواں توانائی نظر نہیں آتی! اسی لیے وہ ان پر معترض بھی ہیں اور ان کو قبول بھی نہیں کرتے۔ اس کے برعکس قیس کا سارا عمل حرکت و توانائی کا عمل ہے اسی لئے وہ مجنوں کا احترام بھی کرتے ہیں اور اس کی اہمیت کا اعتراف بھی کرتے ہیں......!!

ہم نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

بجُز قیس اور کوئی نہ آیا بہ روئے کار
صحرا، مگر بہ تنگیٔ چشم حسود تھا

ہر اِک مکان کو ہے مکیں سے شرف، اسدؔ
مجنوں جو مرگیا ہے تو جنگل اُداس ہے!!

غالبؔ نے اپنی متجسس طبیعت کی وجہ سے اپنی شاعری کے ذریعے اپنی تخلیقی شخصیت کے تمام امکانات سے کام لیا اور ایک ایسی فضا تخلیق کی جو آج بھی اپنی تازگی اور حرکت و نمو کے اعتبار سے اُردو شاعری کے لئے مثالی حیثیت رکھتی ہے......!

بت شکن غالبؔ:

اسی تجسس و تفحص و تفتیش نے غالب کو بت شکن بنا دیا۔ انسانوں نے ہمیشہ خواب دیکھے ہیں اور دیکھتے رہیں گے۔ اپنے سینوں کو تمناؤں سے معمور کیا ہے اور معمور کرتے رہیں گے......اور اگر ان اُمنگوں خواہشوں، خوابوں اور آرزوؤں کا تجزیہ کیا جائے

تو یہ بات بہت جلد ذہن میں چبھنے لگتی ہے کہ ہر شخص اپنے حوصلے اور سہارے کی ضرورت کے مطابق ایک یا کئی بت بنالیتا ہے اور انہیں پوجتا ہے۔ کبھی کبھی اسے تنہا پوجنے سے سیری نہیں ہوتی تو دوسروں کو بھی بہ جبر یا بہ ترغیب اپنے ساتھ شریک کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کی بت پرستی کا ایک ذاتی توہم معلوم نہ ہو بلکہ عقل کا فیصلہ نظر آنے لگے...... یہ چیز انفرادی سے بڑھ کر اجتماعی بھی ہوسکتی ہے دوسرے لوگ اور دوسرے گروہ اپنے لئے دوسرے بت بناتے اور انہیں پوجتے ہیں...... پھر یہی نہیں بلکہ دوسروں کے بتوں کو توڑنا بھی چاہتے ہیں، اس طرح بت بنتے بھی رہتے ہیں اور ٹوٹتے بھی رہتے ہیں......!! اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پجاری گھبرا کر اپنے ہی بنائے ہوئے بت کو توڑنا چاہتا ہے تاکہ اس سے بہتر بت بنائے۔ دل و دماغ میں کشمکش ہوتی ہے اور پجاری ہمت سے کام لیتا ہے تو بت شکن بن جاتا ہے......!! یہ ایک بڑی کہانی ہے جسے ہر شخص چھوٹے یا بڑے پیمانے پر اپنی زندگی میں دہراتا ہے......!

غالبؔ نے بھی بت پوجے اور بت شکنی بھی کی......!! بت شکنی کا یہ حوصلہ پوری طرح نکلا یا نہیں! یہ تو معلوم نہیں لیکن اتنا معلوم ہے کہ انہیں ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد پانے کی تمنا بھی تھی اور گناہوں پر فخر کرنے کا حوصلہ بھی تھا۔ ان کی انفرادیت تمام بتوں کو توڑ پھینکنا چاہتی تھی ان کی راہ میں صرف ان کی اپنی ذات حائل تھی جو حسرت و یاس کا مجسمہ ہونے کے باوجود انہیں بے حد عزیز تھی......!!

تاب لائے ہی بنے گی، غالبؔ......!
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز!!

جب رسم و رواج، پندار، زہد ریائی، نمائشی دینداری، روایت پرستی، تقلیدی

عشق بازی سب کے بت ایک ایک کر کے توڑ چکے پھر بھی غالب کو ناکامی کا جو احساس ہوا وہ انہی کے الفاظ میں دیکھیے......!!

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور......!!

غالبؔ کے سامنے زندگی نے بہت سے المناک کھیل کھیلے۔ چنانچہ زندگی کی ہر قدر انہیں مشکوک نظر آنے لگی کوئی چیز ایسی نہ تھی جس کا سہارا لے کر وہ کھڑے ہو جاتے۔ اس لیے کبھی کبھی وہ ساری دنیا کو انسانی ذہن کا مفروضہ سمجھنے لگتے تھے......اور پکار اُٹھتے تھے......!!

ہستی کے مت فریب میں آجائیو، اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے......!!

لیکن پھر ان کے دل و دماغ میں سوال گونجتا تھا......!!

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے......!!؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے!!؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
عشوہ و غمزہ و ادا کیا ہے!!؟

حقیقت کی اس جستجو نے انہیں بت شکن بنایا تاہم وہ ان حقیقتوں کی نفی نہیں کر سکتے تھے، جو ان کی مادی زندگی پر اثر انداز ہوتی تھیں، وہ "میں" کا بت نہ تو پاش

پاش کرنا چاہتے تھے، اور نہ یہ ان کے بس میں تھا کہ مکمل تخریب کر کے کائنات سے زندگی کی آگ ہی بجھا دیں...... ان کی انفرادیت اور خود شناسی تو کوئی اور ہی خواب دیکھ رہی تھی......!!

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

سب سے بڑا بت جو انسان کی راہ میں حائل ہوتا ہے وہ آباء و اجداد کی تقلید اور رسم و رواج کی پیروی کا بت ہے...... جس نے اسے توڑ لیا اس کے لئے آگے راستہ صاف ہو جاتا ہے۔ کہنے کو تو یہ ایک خیالی بت ہے لیکن غور و فکر کی ساری نوعیت اس سے بدل جاتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ذہنی غلامی مادی اور جسمانی غلامی سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہے...... غالبؔ نے اسے خوب سمجھا تھا اور بار بار اس کے ٹکڑے اڑائے تھے، انہیں معلوم تھا کہ عقل و خرد رکھنے والے بھی تقلید ہی کے دائرے میں چکر کھاتے رہتے ہیں...... اور جب تک یہ پابندی ہے اس وقت تک کوئی بڑا کام نہیں ہو سکتا...... بنے بنائے راستوں سے الگ ہو کر نئی راہ نکالنا اور اس پر چلنا بہت مشکل ہوتا ہے...... کیونکہ ایسا قدم اُٹھاتے ہوئے انسان کو اپنے ہی خیالوں سے ڈر لگنے لگتا ہے...... غالب بھی اپنے خیالات کی تندی اور تیزی سے گھبراتے تھے......!

ہجومِ فکر سے دل مثلِ موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

اس کے باوجود وہ فکر کرتے اور کہتے ہیں!

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

غالبؔ کا زمانہ مغل سلطنت اور قدیم جاگیرداری نظام کے زوال کا دور تھا، اس نظام میں جتنی قوت تھی وہ ختم ہو چکی تھی (اور تھوڑے سے تصرف کے ساتھ)

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی، سو وہ بھی خموش تھی

اُس وقت کی مادّی کمزوری نے تقلید رسم پرستی اور بے عملی کی شکل اختیار کر لی تھی، نگاہیں مستقبل کا پردہ چیر کر کچھ نہ دیکھ سکتی تھیں ہاں ماضی کی شان و شوکت اور عیش و عشرت کا خیال بار بار آتا تھا......! اور وہی وہم پرستی بن جاتا تھا، لوگ انھی بے جان قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے تھے، اور جہاں کوئی ان سے ہٹنا چاہتا لوگ اس کی مخالفت کرتے......! غالبؔ کو ایسے کئی معرکے سر کرنا پڑے اور جن بتوں کو توڑنا تھا توڑتے ہی رہے......! مرزا تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو کچھ لکھ گئے ہیں وہ حق ہے۔ کیا آگے آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے؟"

مجتہد غالبؔ:

رسم پرستی اور تقلید کے خلاف حساس انسان ہمیشہ آواز اُٹھاتے رہتے ہیں لیکن جس شاعری کی آواز میں بت شکنوں کے نعرے کی گونج پیدا ہوئی وہ غالبؔ ہی ہیں۔

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

ایسی انفرادیت کس قسم کی نفسیاتی اور سماجی حالات میں نمو پاتی اور ترقی کرتی ہے، یہ ایک الگ بحث ہے البتہ اتنا طے ہے کہ غالب کسی کی مدد سے حقیقت کی تلاش میں نہیں نکلنا چاہتے تھے...... کسی کے سہارے اس راہ کو طے کرنا انہیں پسند نہ تھا......!!

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

ہنگامۂ زبونی ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

اپنا وہ نہیں شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

عملی زندگی میں تو نہیں ہاں خیال کی زندگی میں یقیناً غالبؔ نے وہ راستے طے کیے جن پر چلنے کی دوسرے جرأت نہ کر سکتے تھے......رسم ورواج کے سہارے زندگی کو طوفان سے بچا لے جانا اور بات ہے، اور سہارے توڑ کر حقیقت کی جستجو خود کرنا دوسری بات ہے۔ایک عظیم شخصیت یہی دوسری راہ پسند کرتی ہے۔غالبؔ کا زمانہ عام انسانوں کے لئے تقلید اور روایت پرستی کا زمانہ تھا اور حساس انسانوں کے لئے تشکیک کا۔غالب بھی شک کا شکار تھے لیکن شکوک کو روند کر آگے بڑھ جانا چاہتے تھے......!!

بہ فیض بے دلی، نومیدیٔ جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

اور یہی نہیں بلکہ تشکیک کے حال سے نکلنے کے لئے وہ روحانیت کی مقرر قدروں کو چھوڑ کر نئی قدریں بھی بنانا چاہتے تھے......!!

دل گزرگاہ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا

مذہب کے معاملے میں آزادہ روی دوسرے صوفی شعراء کے یہاں بھی پائی جاتی ہے لیکن جو بات غالب کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ اِن کا استدلال ہے......!!

وفاداری، بہ شرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو!

نہیں ہے سبحہ وزنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے!!

یہاں شیخ و برہمن دونوں کے پندار کا بت پاش پاش ہوتا نظر آتا ہے......!اور دونوں ہی ایک سطح پر دکھائی دیتے ہیں اور دونوں کے اندر جو قدر مشترک ہے وہ اپنے عقیدے سے وفاداری ہے۔یہ نہیں کہ عقیدہ کیا ہے!انسانیت کے وسیع دائرے میں "زنار" اور "تسبیح" ......کعبہ اور کنشت......اور دیر و حرم کا فرق ختم ہوجاتا ہے......!!

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر!!

کعبہ میں جا رہا، تو نہ طعنہ دو کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو......!؟

یہی وسیع انسانی جذبہ تھا جس نے ان سے ایک خط لکھوایا: "میں تو بنی آدم کو مسلمان ہو یا ہندو، یا نصرانی، عزیز رکھتا ہوں، اور اپنا بھائی گنتا ہوں، دوسرا مانے یا نہ مانے"۔ اس آزاد خیالی میں وہ مذہب سے بالکل علیحدگی تو اختیار نہ کرنا چاہتے تھے، لیکن مذہب کے نام پر جو بت تراشے جاتے ہیں وہ ان کو پوجنا نہیں چاہتے تھے......!

بندگی میں بھی وہ خود آزاد و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے
مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

لوگ عبادت پر ناز کرتے ہیں......! زہد و تقویٰ پر فخر کرتے ہیں اور اپنی عقل پر غرور کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دنیا ان کے سامنے سر جھکا دے، لیکن ان باتوں کی حقیقت غالب کی شاعری میں یوں نمایاں ہوتی ہے......!

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُرد یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت، لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ! یہ خیال اچھا ہے

کیوں نہ جنت کو بھی دوزخ میں ملالیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

زندگی کو نت نئے تجربات کی راہ پر ڈالنا اور بندھے ٹکے اصولوں سے انحراف کر کے زندگی میں نئی قدروں کی جستجو کرنا بت شکنی ہے......اور یہ عمل خیال کی دنیا میں غالبؔ بار بار دہراتے رہتے تھے، کبھی کبھی تو بت شکنی کی لے اتنی بڑھ جاتی تھی کہ محبوب اور محبت بھی خطرے میں پڑ جاتے تھے اور محبت کا مثالی تصور بدلتا ہوا معلوم ہوتا تھا......!

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بُتِ بیداد گر کو میں

عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے، لیلیٰ، مرے آگے!!!

اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو بت سازی بت فروشی بت پرستی اور بت شکنی ہر منزل، غالبؔ کے یہاں ملتی ہے، جس میں بت شکنی کا جذبہ سب سے زیادہ شدید اور واضح

ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو بت توڑا جائے وہ لازمی طور پر توڑنے ہی کے......!! لیکن بت شکن اسی وقت ایک بت کو توڑتا ہے جب دوسرا اس سے بہتر بنالیتا ہے، یا بنانے کی آرزو اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ یہی زندگی کا راز ہے اور یہی ترقی کا......! غالب کے شاگرد حالیؔ نے اس تسلسل کو یوں پیش کیا ہے......!

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں!
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں!

غالبؔ نے پامال راستے کو چھوڑ کر ایک نیا راستہ اختیار کیا۔ آگے بڑھے چلے جاتے تھے کہ پلٹ کر دیکھا تو زمانے کو میری روش پسند نہیں......لوگوں کی دل شکنی کا خیال ہوا، ناچار خود اس راستے کو چھوڑ کر پامال راستے سے ملی ہوئی ایک پگڈنڈی نکالی جس پر عمر بھر گام زن رہے اور رفتہ رفتہ زمانے کو اس پر چلا کر چھوڑا......!

بقول شاعر:

ہم ہواؤں کے رُخ بدلتے ہیں
آئے دنیا ہمارے ساتھ چلے......!

غالبؔ ایک بڑی رنگین پرکار اور پہلودار شخصیت رکھتے تھے ان کی زندگی کے ایک ایک پہلو میں ان سب کا عکس دکھائی دیتا ہے ان کی ہر بات ایک مقام سے شروع ہوتی ہے اور ایک مقام تک پہنچتی بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ روتوں کو ہنسا سکتے ہیں اور مردہ دلوں میں جولانی کی لہر دوڑا سکتے ہیں۔ زندگی ہر حال میں ان کا دامن تھام کر چلتی ہے ان کے پاس ایسا جادو ہے کہ وہ جس طرف بھی جا نکلتے ہیں ہر چیز سے زندگی ابلنے لگتی ہے۔ سوتے ہوؤں کو جگانا، جاگتے ہوؤں کو ہنسانا، اور ہنستے ہوؤں کو بلندیوں پر پہنچانا، ان

کے لئے کوئی بات ہی نہیں ان سے قربت حاصل کرنے والے کے لئے اس قدر حسین ہو جاتی ہے کہ وہ ایک لمحے کو بھی اس سے علیحدگی کا خیال دل میں نہیں لاتا وہ اس میں ڈوبنا اور کھو جانا چاہتا ہے اس کی نظریں زندگی کے ہر پہلو میں حسن رکھتی ہے۔ ہر بات میں اسے رنگینی اور رعنائی کا بسیرا نظر آتا ہے......!!

غالب کی باتیں اسے زندگی کا گرویدہ بنا دیتی ہے......اور وہ اس کے مسرتوں کا شیدائی ہو جاتا ہے۔ نشاط حیات سے اسے قربت حاصل ہوتی ہے اور اس کو سارے اسرار و رموز اس پر کھل جاتے ہیں غالب کی سحر کار شخصیت کا یہ ادنیٰ سا کرشمہ ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ غالبؔ نے زندگی کو صرف ایک رنگین عینک سے دیکھا ہے اور رنگینی رعنائی شوخی اور شگفتگی کے سوا اس میں انہیں اور کوئی چیز نظر نہیں آئی......ایسا نہیں ہے بلکہ غالبؔ زندگی کے سرد و گرم سے اچھی طرح واقف ہیں......اور سرد سے کم اور گرم سے بہت زیادہ واقف ہیں۔ انہوں نے زندگی کے نشیب و فراز کو دیکھا ہے اس کے روشن و تاریک دونوں پہلوؤں کا تجربہ ہے۔ انہیں اس بات کا بخوبی علم ہے کہ فرصت ہستی یہاں کم ہے۔ زمانہ کسی کو کچھ نہیں دیتا۔ وہ خود ان منزلوں سے گزرے ہیں۔ زندگی میں انہیں مسرت ہی نہیں غم بھی ملا ہے۔ اور یہ غم ہی ان کی باغ و بہار شخصیت پر محیط ہے۔ اسی لئے وہ اپنے آپ کو خود اپنی شکست کی آواز سمجھتے ہیں، لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ اس کے باوجود انہوں نے اپنی شخصیت میں گُلِ نغمہ اور پردۂ ساز ہونے والی خصوصیت بھی باقی رکھی ہے......! اور یہی ان کی بڑائی ہے...... اِن کی شخصیت اور شاعری میں شوخی کا جو پہلو ہے وہ اسی صورت حال کا عکاس ہے۔ ان کی اُداسی شوخی اور شگفتگی کو ختم نہیں کرتی بلکہ اس کا رنگ گہرا کر دیتی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ غالبؔ اپنی زبوں حالی اور بے بسی پر بھی ہنس سکتے ہیں۔ اُداسی کے

عالم میں ہنسنا اور کرب کی حالت میں مسکرانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں! اس منزل سے تو وہی ہمکنار ہو سکتا ہے جس نے ہر اعتبار سے اپنی تہذیب کر لی ہو۔ غالبؔ ایسی ہی شخصیت کے مالک تھے......!!

شوخ غالبؔ:

اگر چہ یہ ہے تو بہت بڑا دعویٰ لیکن اس کے حقیقت ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ اُردو میں ان کی سی باغ و بہار شخصیت کا شاعر کوئی اور پیدا نہیں ہوا، یوں تو سوداؔ، انشاؔ، اور اکبرؔ ایسے شاعر بھی پیدا ہوئے ہیں جن کی شخصیت کی بنیاد ہی شوخی اور شگفتگی پر ہے، لیکن غالبؔ کی شخصیت میں جو بات تھی وہ ان شاعروں میں بھی نہیں ہے ان کے یہاں شوخی ضرور ہے لیکن ان کی شوخی کی تہ میں کسی سے الجھنے کسی سے دست و گریباں ہونے اور کسی کی نفی کرنے کا ہاتھ ضرور کام کرتا ہوا نظر آتا ہے......!!

غالبؔ کے یہاں یہ الجھنے اور دست و گریباں ہونے والی بات نہیں ہے وہ کسی شخص یا شے سے نفرت کرنے کا قائل نہیں ہے۔ اسی لئے وہ کسی پر آوازیں نہیں کستے۔ کسی کی پھبتیاں نہیں اُڑاتے وہ ہر چیز سے محظوظ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انہیں غلط باتوں پر بھی مسکرانا آتا ہے۔ اس لئے کہ ان کے پاس انسانی کمزوریوں کا شعور موجود ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ غالبؔ کی شخصیت میں بڑا غم ہے...... زندگی سے متعلق ان سے جو تقاضے تھے وہ پورے نہیں ہوئے انہوں نے جس بات کی تمنا کی تھی وہ تکمیل سے ہمکنار نہیں ہوئی۔ اگر چہ ان کے ارمان بہت نکلے لیکن پھر بھی کم نکلے! ان کے دل میں حسرت ہستی کا داغ ہے اور اس صورت حال کو انہوں نے کچھ زیادہ ہی محسوس کیا ہے اس لئے کہ ان کا دل غم کھانے میں بہت بودا ہے۔ لیکن داغ حسرت ہستی سے پیدا ہونے والے غم اور

نے گل فام کی کمی سے پیدا ہونے والے رنج نے ان کے یہاں اُداسی کی تاریکی پیدا نہیں کی ہے اس اُداسی کے باوجود ان کے یہاں روشنی کا احساس ہوتا ہے......ان کا کمال یہ ہے کہ وہ اس غم کے باوجود زندگی میں دلچسپی لے سکتے ہیں مسکرا سکتے ہیں۔وہ روتے ہیں لیکن انہیں رونا نہیں آتا......اس لئے وہ روتے میں بھی ہنستے ہیں۔انہیں ہنسنے پر رونا نہیں مگر رونے پر ہنسنا ضرور آتا ہے......اور ان کی شخصیت کی یہ خصوصیت بڑی حد تک اس سماجی تہذیبی اور فکری ماحول کی پیدا کردہ جس میں انہوں نے آنکھ کھولی اور جس میں ان کے ذوق وشعور نے نشوونما پائی......!!

غالبؔ کے مزاج کی شوخی سب سے زیادہ ان کی شاعری میں اپنے آپ کو نمایاں کرتی ہے۔اس شوخی نے،اس میں زندگی اور جولانی پیدا کی ہے،جدت اور اپج پیدا کی ہے۔رنگینی اور پرکاری پیدا کی ہے اور ان سب نے مل کر اس کا اچھا خاصا نگارخانہ بنادیا ہے......!!ایسا نگارخانہ......جہاں ہر تصویر اپنے رنگوں کی شوخی اور تیکھے پن اپنے خطوط کے لوچ اور بانکپن سے پہچانی جاتی ہے......غالب کی شوخی نے ان تصویروں کو زندگی سے اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک منہ سے بولتی ہوئی نظر آتی ہے۔اسی لئے ان میں کھوجانے کو جی چاہتا ہے......!!

یہ شوخی غالبؔ کی شاعری کا کوئی ایک پہلو نہیں ہے۔ان کی شاعری کے ہر پہلو میں یہ شوخی نظر آتی ہے۔غالبؔ کی شاعری میں تنوع ہے۔وسعت ہے اور ہمہ گیری ہے......اور اس تنوع وسعت اور ہمہ گیری میں شوخی کا عنصر ضرور نمایاں نظر آتا ہے۔انہوں نے حسن وعشق کے معاملات اور واردات وکیفیات کی تصویر کشی بھی ہے......اور اس کے ان گنت پہلوؤں کو اپنی غزلوں کا موضوع بنایا ہے......تصوف کے مسائل اور فلسفے کے

نکات بھی انہوں نے اپنی غزلوں میں پیش کیے ہیں...... عرانی اور تہذیبی معاملات کے اسرار و رموز کو بھی جگہ دی ہے اور ان سب کے بیان میں ان کی طبیعت کی شوخی عجیب عجیب زاویوں سے اپنے آپ کو نمایاں کرتی رہی ہے۔ یہ شوخی بذات خود بھی اہم ہے لیکن اس کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ ہوگئی ہے کہ اس نے غالب کی شاعری میں ایک نئی فضا ایک نیا انداز اور ایک نیا آہنگ پیدا کر دیا ہے اور اس طرح ان کی غزلوں میں معنوی اور فنی اعتبار سے ایک نئی زندگی کی لہر دوڑا دی ہے......!!

غزل کی شاعری سوز و گداز کی شاعری ہے...... وہ شوخی اور شگفتگی کو گوارا نہیں کرتی...... غالب کا کمال یہ ہے کہ انہوں کی شوخی اجنبی اور نامانوس معلوم نہیں ہوتی بلکہ ان کے مزاج کا جزو معلوم ہوتی ہے...... اور ان کا بنیادی حصہ نظر آتی ہے۔ غالبؔ نے اس شوخی کو غزل کے کسی ایک مضمون میں پیدا نہیں کیا ہے بلکہ جتنے مضامین بھی غزل کے موضوع بنتے ہیں اور جن کو انہوں نے اپنا موضوع بنایا ہے ان سب میں جگہ جگہ اس شوخی کو ظاہر کیا ہے...... اور ایسا کرنے کے لئے نہ تو انہیں کوئی شعوری کوشش کرنا پڑی اور نہ سعی و کاوش سے کام لینا پڑا...... یہ شوخی تو ان کے یہاں فطری طور پر از خود پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے غزل کے ہر مضمون میں اس کے اثرات ملتے ہیں...... حسن کے بیان میں بھی شوخی کا پہلو نظر آتا ہے...... محبوب اور اس سے متعلق مضامین میں بھی یہ شوخی موجود ہے۔ عاشق اور معشوق کے روابط اور ان روابط کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معاملات میں بھی شوخی کا پتہ چلتا ہے...... عشق اور کاروبار شوق کی تفصیل میں بھی اس شوخی کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں...... غرض غالبؔ کسی جگہ بھی شوخی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے...... بلکہ وہ تو اپنی شاعری کو موثر بنانے میں اس سے بڑا کام لیتے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان کے ایسا

کرنے سے غزل کے کارگہِ شیشہ گری کو ٹھیس بھی نہیں لگتی اور اس کی آب وتاب پوری طرح باقی رہتی ہے......!!

اُردو غزل میں عشق کا آغاز دل دینے سے ہوتا ہے...... عاشق کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے گویا وہ اپنا دل محبوب کو دے دیتا ہے...... اور اس طرح اس کو اپنے دل سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں...... محبوب اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی انجان بن جاتا ہے اور محبت کرنے والے کی پرواہ نہیں کرتا...... غالبؔ نے اس مضمون کو پیش تو کیا ہے لیکن اس خیال کو پیش کرتے ہوئے صرف یہ بات ہی نہیں کہی ہے کہ عاشق نے دل محبوب کو دے دیا اور محبوب نے لے لیا...... اور اس طرح عاشقی شروع ہو گئی......!! بلکہ اس مضمون میں یوں ایک عجیب پہلو پیدا کیا ہے......!!

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے مدعا پایا

غالبؔ یہ کہہ رہے ہیں کہ دل تو ان کے پاس موجود ہی نہیں ہے۔ اس کے گم ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ...ایسی صورت میں محبوب کا شوخی سے یہ کہنا کہ اگر اس کو دل پڑا ہوا مل گیا تو وہ نہیں دے گا، کوئی معنی نہیں رکھتا، یہاں محبوب کے بیان اور اس کے جواب دونوں میں شوخی ہے، اور یہ شوخی ہی اس شعر کی بنیاد ہے......!

غالبؔ حسن پرست ہیں، اور حسن پرست ہونے سے ہی ان کا عشق پھوٹتا ہے، لیکن اس رابطے کا خیال ان کے یہاں کیسے کیسے دلچسپ خیالات پیدا کرتا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں......!

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے
غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

ان اشعار میں چاہے بڑی حقیقتوں کا بیان نہ ہو، چاہے یہ غزل کے سنجیدہ مضامین سے تعلق نہ رکھتے ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ ان میں شوخی کا جو پہلو ہے جس نے ان اشعار کی تخلیق کروائی ہے، وہ ان میں ایک بڑی پُرلطف فضا پیدا کر دیتا ہے......!

اس شوخی کے پہلو نے غالبؔ کی غزلوں میں بعض ایسے مضامین بھی پیدا کیے ہیں جو بالکل اچھوتے اور نئے ہیں...... جنہیں غزل کی روایت میں پیش کرنا عام نہیں ہے، مثلاً ''حسرتِ دیدار'' کا مضمون، غزل میں بہت عام ہے اور اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ عاشق کو جب کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو اسے بہر حال محبوب کے دیدار کی حسرت رہتی ہے اور وہ حسرت دیدار کے اس پیغام کو محبوب تک مختلف ذرائع سے پہنچ جاتا ہے...... لیکن غالبؔ کی شوخی حسرت دیدار کے اس پیام کو محبوب تک بالکل ایک نئے اور اچھوتے انداز میں پہنچاتی ہے...... وہ سرنامے پر آنکھ کی تصویر کھینچتے ہیں تا کہ خط کو شروع کرتے ہی محبوب پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ عاشق حسرتِ دیدار کا شکار ہے......!!

آنکھ کی تصویر سرنامے پہ کھینچی ہے کہ تا
تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

سرنامے پر آنکھ کی تصویر کھینچنا ایک ایسا خیال ہے جس میں حد درجہ سادگی اور معصومیت ہے۔ لیکن اس میں شوخی کا رنگ بھی بہت تیکھا ہے اور یہی اس شعر کی جان

ہے......!!

یہ شوخی ایک جگہ غالب کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ساری دنیا کو چھوڑ کر شہر بھر میں کان پر قلم رکھ کر یہ آواز لگاتے پھرے کہ اگر کسی کو خط لکھوانا ہو تو ہم سے لکھوائے۔ اس خیال سے کہ محبوب کو بھی ان گنت خط لکھواتا ہوں گے۔ ہو سکتا ہے، انہی سے لکھوالے اور اس طرح شہر کے جو لوگ محبوب کو خط لکھتے ہیں ان کا بھی علم ہوتا رہے گا، اور دلچسپی بھی رہے گی ،وقت بھی اچھا گزرے گا......!!

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

گویا عاشق کے لئے اب کوئی اور مشغلہ ہی نہیں رہ گیا سوائے اس کے کہ وہ صبح سے شام تک خط لکھتا پھرے۔ یہ ایک مضحکہ خیز سا خیال ہے۔ لیکن اس کے مضحکہ خیز ہونے ہی میں شوخی ہے......اور اس شوخی نے شعر میں جدت پیدا کر دی ہے۔

غزل میں اس خیال کی ترجمانی بہت عام ہے کہ عاشق محبوب کے بوسے کا متمنی ہوتا ہے اور اس تمنا کا اظہار وہ نہ جانے کس کس طرح کرتا ہے۔ غالبؔ اس مضمون کو ایک بالکل نئے انداز میں پیش کرتے ہیں......دیکھئے اس شعر میں حسن طلب شوخی کے ساتھ ہے......!!

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا کہ یوں؟

منہ سے بتانے میں حسن طلب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ بوسے ہی کی صورت میں نکل سکتا ہے......!! اور شوخی اس اظہار تمنا اور حسن طلب کی بنیاد ہے۔ ایک اور

شعر میں غالبؔ نے اس سے بھی زیادہ تیکھے انداز میں اس مضمون کو باندھا ہے......!

بوسہ دیتے نہیں، اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

اس شعر کی بنیاد بھی شوخی ہے۔ اگر اس شوخی کا پہلو نہ ہوتا تو اس شعر کو مبتذل کہا جاتا۔ جب ابتذال کا خیال آتا ہے شوخی سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے اور ابتذال کی طرف سے توجہ ہٹا کر اپنی طرف منعطف کر لیتی ہے......!!

اُردو غزل کی روایت میں عاشق کا محبوب کے کوچے میں جانا بڑی عام بات ہے اور شعرا نے اس مضمون کو مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ غالب بھی دوسرے غزل گو شاعروں کی طرح محبوب کے کوچے میں جاتے ہیں لیکن منفرد انداز سے......!

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کُھلا

یہ خیال غزل کی روایت سے تعلق نہیں رکھتا......! اور خاصا مضحکہ خیز سا خیال ہے۔ لیکن غالب کی شوخی نے اس کی مضحکہ خیزی کو پس منظر میں ڈال دیا ہے اور اس طرح موضوع میں جان ڈال دی ہے۔ غرض محبوب غالبؔ کا بستر گول کر دیتا ہے لیکن وہ چین سے نہیں بیٹھتے اور اس کے کوچے کے چکر لگاتے رہتے ہیں اور بے آبروئی پر ہنسنے کی وجہ بھی تلاش کر لیتے ہیں......!

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

غزل میں محبوب کی مجلس آرائی کو بھی تقریباً ہر شاعر نے پیش کیا ہے۔ لیکن اس

سے مراد محبت کرنے والے کی تذلیل ہوتی ہے۔ محبوب محبت کرنے والے پر زیادتی کرتا ہے اور ہر صورت میں تان اس کی ناکامی اور پامالی پر ہی جا کر ٹوٹتی ہے۔ اور یہ سب کچھ خاصی سنجیدہ فضا میں ہوتا ہے، ایک لمحے کو بھی یہ بات محسوس نہیں ہوتی کہ شاعر جو کچھ کہہ رہا ہے اس کا مقصد تفنن طبع ہے بلکہ ہمیشہ اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ جو باتیں اس نے اس سلسلے میں کہی ہیں وہ حرف بہ حرف صحیح ہیں......! غالبؔ اس مضمون کو پیش ضرور کرتے ہیں لیکن اس طرح کہ اس میں سنجیدگی کو دخل نہیں ہوتا بلکہ فضا شوخ ہوتی ہے......!

میں نے کہا کہ بزمِ ناز، غیر سے چاہیے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں؟

یہاں حزن و یاس اور ذلت و رسوائی سے کہیں زیادہ محبوب کی ستم ظریفی کا احساس چھپا ہوا معلوم ہوتا ہے، اور غالبؔ نے شوخی ہی کے سہارے یہ صورت حال پیدا کی ہے......!

غالبؔ کی غزلوں میں مختلف موضوعات سے متعلق بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن سے محبت کرنے والے کی ناکامی، حسرت، مجبوری اور معذوری کا احساس ہوتا ہے، لیکن ایسے اشعار میں بھی غالبؔ اپنی شوخی سے ایسا ماحول پیدا کر دیتے ہیں جس میں شگفتگی ہوتی ہے......!!

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟!

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا؟!

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں......!
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں......!

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!!

ان اشعار میں حسرت اور مایوسی کی فضا ضرور موجود ہے......لیکن ان میں غالبؔ کی شوخی بہر صورت کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور غالبؔ کے کلام میں ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے......!

اُردو غزل میں محبوب سے ملنے اور ملاقات کرنے کے جن طریقوں اور وسیلوں کا بیان ہے، ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے......! کسی شاعر کی جگہ محبوب کی دیوار کے سایے تلے ہے۔ کسی نے گھر کے سامنے مکان بنالیا اور کوئی کسی بہانے سے محبوب کی محفل میں پہنچ گیا لیکن غالبؔ پامال راستے سے ہٹ کر چلنے کے عادی ہیں، دیکھیے محبوب سے ملنے کے لئے کیسا لطیف وسیلہ تلاش کرتے ہیں!

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

ظاہر ہے کہ مصوری ایک نہایت ہی لطیف فن ہے اور اس کو مہ رُخوں سے

ملاقات کے لئے ذریعہ بنانا اس سے بھی زیادہ لطیف بات ہے......! جس کو غالب کی شوخی ہی پیدا کر سکتی ہے۔

روایت شکن غالب:

غالب کی غزل میں روایت کا رچا ہوا شعور ملتا ہے......لیکن وہ روایتی شاعر نہیں ہے......روایت کے اثر سے انہوں نے تغزل میں گل کاریاں کی ہیں......! البتہ روایتی انداز سے انحراف ہے، اس لئے کہ وہ چبائے ہوئے نوالوں کو چبانے کے قائل نہیں ہیں۔ چنانچہ روایتی موضوعات سے وہ اس حد تک برگشتہ ہیں کہ کہیں کہیں ان کو طنزیہ انداز میں پیش کرتے ہیں جس سے ان موضوعات کی نفی ہوتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے غالبؔ ہماری شاعری کے روایتی موضوعات پر فقرے چست کر رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار اس صورت حال کے پوری طرح ترجمان ہیں......!!

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں......!!

لاغر اتنا ہوں کہ گر تُو بزم میں جا، دے مجھے
میرا ذمہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

ہے جو کیا کس کے باندھیے، میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

یہاں تلوار کے بغیر لڑنے محبوب کی کمر کے معدوم ہونے اور اپنے بے حد لاغر

ہونے کی وجہ سے بزم محبوب میں نظر نہ آنے کے مضامین کو سنجیدگی کے ساتھ پیش نہیں کیا گیا ہے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان تمام باتوں کا مذاق اُڑا رہے ہیں...... اسی لئے یہاں سنجیدگی کے بجائے ہلکی پھلکی فضا پیدا ہوتی ہے اور ان سب کے تہہ میں طنز کا ہاتھ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ چنانچہ غالبؔ کی شوخی ان میں ابھر کر سامنے آتی ہے......!!

بہر حال غالبؔ کی غزل میں شوخی کا پہلو مختلف زاویوں سے رونما ہوتا ہے ان کی غزلیں شوخی کے عناصر سے بھری پڑی ہیں...... ان میں بہ اعتبار مضامین جتنے پہلو بھی نمایاں ہیں، ان سب میں شوخی کا پہلو اپنی جھلک ضرور دکھاتا ہے...... ان کا تصوف اور فلسفہ تک اس سے خالی نہیں ہے......!!

یہ مسائلِ تصوف یہ تیرا بیان، غالبؔ......!
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا......!

عظیم غالبؔ:

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے بقول "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، مقدس وید اور دیوانِ غالبؔ"، "لوح سے تحت تک، مشکل سے سو صفحے ہیں، لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں، کون سا نغمہ ہے جو اس کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے؟ شاعری کو اکثر شعراء نے اپنی اپنی حدِ نگاہ کے مطابق حقیقت اور مجاز، جذبہ اور وجدان، ذہن اور تخیل کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے...... مگر یہ تقسیم خود ان کی نارسی کی دلیل ہے...... شاعری انکشافِ حیات ہے...... جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں، شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعین ہے......!!

جمالِ الٰہی ہر شے میں رونما ہوتا ہے...... آفرینش کی قدرت جو صفات باری

میں سے ہے، شاعر کو بھی ارزانی کی گئی ہے جہاں ملائکہ کارخانۂ ایزدی میں پوشیدہ حسن آفرینی میں مصروف ہیں، شاعر یہ کام علی الاعلان کرتا ہے...... اس لحاظ سے مرزا کو ایک ربّ النوع تسلیم کرنا لازم آتا ہے۔ غالبؔ نے بزم ہستی میں جو فانوسِ خیال روشن کیا ہے، کون سا پیکرِ تصویر ہے جو اس کے کاغذی پیراہن پر منازل زیست قطع کرتا ہوا نظر نہیں آتا......!!

اگر ادبی حیثیت سے غور کیا جائے تو دیوانِ غالب یکتا ہے، بلاغت یعنی تقلیلِ الفاظ بلا اختلالِ معنی اس سے زیادہ محال اور نا ممکن ہے۔ کہیں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس کو پُر کن کہا جاسکے۔ فصاحت کی کیفیت ہے گویا دریائے لطافت رواں ہے......!!

اوزانِ شعری کی رو سے دیکھا جائے تو دیوانِ غالبؔ اپنا جواب آپ ہے......!! شعر کی بنیاد عروض پر قائم ہے...... عروض موزونیت کے میزان میں الفاظ کے تولنے کا نام ہے، نقطۂ تعدیل کو پانے کے لئے صدہا نازک سے نازک اور گراں سے گراں اوزان سے کام لیا جاتا ہے...... یہ اوزان شاعری نے موسیقی سے مستعار لیے ہیں...... کوئی آسان سے آسان اور مشکل سے مشکل بحر ایسی نہیں جس میں غالبؔ نے کلام موزوں نہ کیا ہو......! جہاں رواں بحریں ہیں وہی افتاں وخیزاں بحریں بھی ہیں......!!

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمن راحتِ خونِ گرمِ دہقاں ہے

آکہ مری جاں کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

عجب نشاط سے، جلّاد کے چلے ہیں ہم، آگے......!
کہ اپنے سایے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے!

موسیقار غالبؔ:

غالبؔ کے لئے شاعری موسیقی اور موسیقی شاعری ہے یہی وجہ ہے کہ دیوان کا ہر مصرعہ تار رباب نظر آتا ہے...... غالبؔ کی زبان ارضی ہے اور خیالات سماوی ہے ان دونوں کو ملانا گویا لطیف روح اور مکدّر مادّے سے جسم تیار کرنا ہے اسی لئے غالبؔ کی شاعری کے جسم پر زبان کا جامہ تنگ ہے...... چونکہ ان کا موضوع زیادہ تر فلسفہ ہے اس لئے یہ مشکل اور بھی زیادہ ہوگئی ہے...... لہٰذا دیوان غالب میں ایسے اشعار بھی ہیں جن کا مفہوم پانے سے ذہن مطلقاً قاصر ہے......!!

زبان ارتقاء کی پابند ہے الفاظ بے جان نہیں بلکہ زندہ ہیں اگرچہ منطق کے قواعد لاتبدیل ہیں، لیکن تصورات، زمانے کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور چونکہ تصور کی زبان سے ادا کرنے کا کام ہی لفظ ہے اس لئے الفاظ بھی تبدیلی چاہتے ہیں اگر عہد بہ عہد یہ تجدید نہ ہوتی رہے تو زبان کہنہ اور پارینہ ہوجائے...... زبان کی تجدید مذہبی یا تمدنی اصلاح سے آسان نہیں جس طرح رواج پر غالب آنا مشکل ہے، محاورہ کا مٹانا بھی مشکل ہے۔ بہت سے ادیب اس نکتے سے غافل ہیں کہ خوب سے خوب محاورہ بھی بلحاظ عمر، آخر ضعیف ہوکر بے جان ہوجاتا ہے...... چنانچہ اُردو میں اس وقت بہت سے محاورات ہیں جو محض الفاظ اور فقرات کی "ممیاں" ہیں!!! غالباً اسی وجہ سے غالبؔ نے محاورے کی بندش سے اکثر احتراز کیا ہے۔ تمام دیوان میں مشکل سے دس اشعار ایسے ہیں جن میں کوئی محاورہ باندھا ہے...... غالبؔ کی شاعری دلّی کی گلیوں یا لکھنؤ کے کوچوں کی

پابند نہیں بلکہ آزاد اُردو زبان کی شاعری ہے۔جب غالبؔ نے اپنے فلسفیانہ خیالات کے لئے موزوں الفاظ تلاش کیے تو اُردو کے ذخیرۂ الفاظ کو بہت محدود پایا لیکن قاعدہ ہے کہ جہاں نیا خیال پیدا ہوتا ہے وہاں نیا لفظ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے...... ہر جان اپنا جسم خود ساتھ لاتی ہے......!!

الفاظ وتراکیب سازغالبؔ:

غالبؔ کے خیالات نے اپنے اظہار کے لئے خود الفاظ تیار کر لیے بلکہ وقت نے غالبؔ کی مشکل پسند طبیعت کے لئے کام کو زیادہ آسان کر دیا، الفاظ سازی کے فن میں غالب مجتہد کامل کا درجہ رکھتے ہیں۔ان کے ساختہ الفاظ وتراکیب ملاحظہ کیجئے......!

دامِ شنیدن، خمار رسوم، آتشِ خاموش، جوہر اندیشہ، گلبانگ تسلی، شمنستان، دریائے مے، پہلوئے اندیشہ، غرق نمکداں، خانہ زاد زلف، زنجیر رسوائی، موجِ نگاہ، نبض خس، تختۂ فریاد، صیدز دام جستہ، خودداریِ ساحل، شہپر رنگ، برگ ادراک، طالعِ خاشاک، آئینۂ انتظار، لذتِ سنگ، گردشِ رنگ، افشردۂ انگور، شہر آرزو، محشر خیال، مژگان سوزن، مژگان یتیم، مسلکِ عافیت، معاشِ جنون، دامِ تمنا، دریائے بے تابی، سیاستِ دریا، طلسم پیچ وتاب، طعنۂ نایافت، جنت نگاہ، فردوس گوش، گلستانِ تسلی، چشم صحرا، قلزمِ خوں، غبار وحشت، شرار جستہ وغیرہ وغیرہ..........!!

ان الفاظ کی جدت آشکار اور خوبیاں ظاہر ہے۔غالبؔ نے جہاں الفاظ میں نادر اور شستہ تصرفات سے کام لیا ہے وہی تشبیہات واستعارات میں بھی عام پابندی سے گریز کیا ہے......انہوں نے خود آفریدہ اور خود ساختہ تشبیہات و استعارات کا اس بے تکلف انداز سے استعمال کیا ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہمیشہ سے ہماری زبان میں

موجود تھے اور ہزار بار کے سُنے ہوئے ہیں......!!

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

دیکھیے کس خوبی سے موئے آتش دیدہ کو زنجیر سے، دانہ ہائے تسبیح کو صد دل عشاق سے، بہار کو حنائے پائے خزاں سے، جوہر آئینے کو طوطیٔ بسمل سے، حضرت یعقوب کی آنکھوں کو روزنِ دیوار زندانِ یوسفؑ سے، دامِ موج کو حلقۂ صد کام نہنگ سے، قطرۂ خونِ تن کو نگین نام معشوق سے، دریا کو زمین کے عرق انفعال سے، صبح وطن کو خندۂ دنداں نما سے، موئے شیشہ کو دیدۂ ساغر کی مژگاں سے، موج شراب کو مژۂ خواب ناک سے، اور ساغر کو متاع دستِ گراں سے مماثل بیان کیا ہے......!!!

غالبؔ نے صنائع بدائع کا استعمال بہت کم کیا ہے ان کے کلام کے اشکال کا باعث فارسیت کا غلبہ، الفاظ کا ادق ہونا، اور ترتیب کا پس و پیش ہونا ہے......لیکن ایک خصوصیت ان کے کلام میں ایسی ہے جس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں موجود نہیں ہے اور وہ خصوصیت یہ ہے کہ جس طرح سفید رنگ میں تمام آفتابی رنگ مضمر ہیں اسی طرح ان کے بعض اشعار کی سادگی میں عجیب و غریب لطیف معنی پنہاں ہیں......! جیسے کولمبس نے امریکا دریافت کیا تھا حالیؔ نے غالبؔ کے کلام میں اس نئی دُنیا کو تلاش کیا ہے......دیکھیے سادگی میں بھی پرکاری ہے اور معنی آفرینی ہے......!

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے!
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا!

اس کے ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ دشت اس قدر ویران ہے کہ خوف سے گھر یاد

آتا ہے، لیکن یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم تو گھر ہی کے لئے سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی لیکن دشت بھی اتنا ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے......!

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق؟
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ میرے مرنے کے بعد شراب عشق کا کوئی خریدار نہیں اور ساقی یعنی معشوق کو بار بار صلا دینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ ساقی پہلے مصرعے کو مکرر پڑتا ہے، ایک دفعہ بلانے کے لہجے میں یعنی کوئی ہے جو مئے مرد افگن کا حریف ہو؟؟؟ جب اس کی آواز پر کوئی نہیں آتا تو اسی مصرعے کو مایوسی کے ساتھ پڑھتا ہے یعنی کوئی بھی نہیں ہے!

تیرے سرو قامت سے اِک قدِ آدم......!
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں!

اس کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ تیرے سرو قامت سے فتنۂ قیامت کم ہے، اور دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ چونکہ تیرا قد، اسی میں سے بنایا گیا ہے اس لئے وہ ایک قد آدم کم ہو گیا ہے......!!

مصور غالب:

کہتے ہیں کہ شاعری مصوری ہے......اس لحاظ سے بھی "دیوانِ غالب" عدیم المثال اور بے نظیر ہے۔ ہر ورق پر ایسے اشعار موجود ہیں، جن کو صفحۂ قرطاس سے جامۂ تصویر پر منتقل کیا جا سکتا ہے۔ شاعری اور مصوری کے تقابل میں شعر کو تصویر پر فوقیت حاصل ہے، اس لئے کہ تصویر ساکن اور شعر متحرک ہوتا ہے......!! تصویر اپنے قائم کردہ

انداز کو نہیں بدل سکتی، جبکہ شعر ایک کیفیت کی مختلف حرکات کو ظاہر کرنے کی قدرت رکھتا ہے، اگر تصویر رقبۂ حیات پر ایک نقطہ ہے تو شعر ایک دائرہ ہے......!

غالبؔ نے حسن و عشق کے تمام معاملات کو اس خوبی سے نظم کیا ہے کہ ہو بہو تصویر نگاہوں میں پھر جاتی ہے اور اس ادائیگی کے لئے صرف زبان پر قدرت کافی نہیں ہے بلکہ فطرت کا نکتہ داں ہونا بھی ضروری ہے، دیکھئے کیسی کیسی تصویریں ہیں!

رو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے؟!
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے!
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے!

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں!
بوسے کو پوچھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا کہ یوں؟

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے!
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا......؟

قدرت ایک مستور حقیقت ہے۔ قدرت اور عوام کے درمیان ایک دیوار حائل ہے جس میں سے فقط غالبؔ ایسے شاعر کی نظروں کی شعاعیں گزر سکتی ہیں، غالب کی چشمِ بینا کو قدرت کو تمام نقابِ نگاہ سے دیکھتی ہے، اور ہر نظر میں ایک نیا جلوہ پاتی ہے، جن میں

مظاہر قدرت کو غالبؔ دیکھتے ہیں دوسرے شعراء یا تو انہیں بالکل عام سمجھ کر ان پر غور ہی نہیں کرتے یا ان میں اتنی شعریت نہیں پاتے کہ ان کی کیفیت کو اپنے کلام میں بیان کریں......! اور اگر بیان کر دیتے ہیں تو کامیاب نہیں ہوتے...... غالب کی نظر دیکھئے!

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے!
شعلۂ عشق، سیہ پوش ہوا میرے بعد!!

سادہ و پرکار غالبؔ:

غالبؔ کے کلام کی عجیب سادگی و ہوشیاری اور عجیب تر بے خودی و پرکاری انتہائی کمال پر ہے۔ بعض لوگ ان کے کلام کی سادگی سے سخت مغالطے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس میں کوئی خاص بات نہیں! ہر شاعر ایسا لکھ سکتا ہے، یہ ایک فریب ہے۔ ہر شخص سمجھتا ہے کہ وہ ان تمام اشیا کو جو اس کے سامنے ہے، خوب جانتا ہے اور ان کے حسن و قبح بیان اور اظہار کی قابلیت رکھتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ فقط چند منتخب و مخصوص افراد کے سوا دنیا میں کوئی شخص بھی اپنی گرد و پیش کی ادنیٰ اشیا کی محض صورت سے بھی واقف نہیں...... یہی وجہ ہے کہ اگر اس سے کہا جائے کہ ان اشیا کا نقشہ الفاظ یا آواز یا رنگ میں اتار دو، تو وہ ناکام ہو جائے گا......! غالب کی کئی غزلیں ایسی ہیں جن پر ابن رشیق کا یہ شعر صادق آتا ہے......!!

فاذا قیل اطمع الناس طرّاً
واذا ریم اعجز المعجزینا

جب پڑھا جائے تو ہر شخص کو یہ خیال ہو کہ میں بھی ایسا کہہ سکتا ہوں لیکن جب ویسا کہنے کا ارادہ کرے تو معجز بیان بھی عاجز ہو جائے......!

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟
آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

کوئی دن گر زندگانی اور ہے......!!
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے......!!

بیسویں صدی کی اُردو نثر اور نظم میں غالبؔ کے اشارات سے کیسے کیسے نقش و نگار بنائے گئے ہیں، ان کے اجمال کی کیسی کیسی تفصیلات ملتی ہیں، نثر اور نظم دونوں میں گہرائی کے لئے لوگ اب بھی غالب کے ممنونِ احسان ہیں۔ غالب اب بھی غالب ہیں......!!

غالبؔ سے پہلے اُردو شاعری کے پاس جذبات تھے، احساسات تھے، زبان و

بیان کے کرشمے تھے، لیکن وہ حسین اور شوخ ذہانت نہیں تھی جو پیکر الفاظ میں روح پھونک دیتی ہے......!! یہ غالبؔ کا عطیہ ہے اور اس پر اُردو جتنا بھی فخر کرے کم ہے............!!

وہ اپنے قدیم سرمایے سے واقف تھے، لیکن اس کی ہر رسم اور قید کے پابند نہیں تھے، اسی لئے ان کی شاعری افسون و افسانہ نہیں ہے۔ اس میں نفس گرم کی آمیزش، خون جگر کی نمود خیالات کی ادائیگی کا نیا اسلوب، سوچنے کے لئے حکیمانہ انداز اور جانچنے کے لئے تنقیدی شعور ہے۔ یہ انداز و اسلوب، حال اور مستقبل دونوں کے لئے اہم ہے......!

انفرادیت پسند غالب:

غالبؔ نے اُردو شاعری کو ایک نیا فکری کردار بخشا۔ وہ ایک روایت پرست دور میں انوکھی اور روایت کے احساس سے آشنا انفرادیت لے کر اٹھے اور تاریخ کے دوراہے پر اپنے واضح نقوشِ قدم چھوڑ گئے اور اس طرح ایک نئی روایت قائم ہوئی......!

غالبؔ اُردو شاعری میں ایک نئی داخلیت کا تصور لے کر داخل ہوئے۔ یہ داخلیت نہ محدود تھی نہ متصوفانہ، اس کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ کائناتی شعور بھی اس کے لئے اجنبی نہیں، اپنی شخصیت اور صداقت کو بھولے بغیر، غالبؔ نے شاعری میں فکر و کردار کو راہ دی، ان کے نزدیک خیال اور جذبے کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں۔ فکر اور تاثر، احساس اور ادراک، ایک ہی کل کے مختلف اجزاء ہیں...... یہی وجہ ہے کہ فلسفیانہ آہنگ کے باوجود غالبؔ، شاعری کے حسن اور جمالیاتی نکھار سے غافل نہیں رہتے......!!

غالبؔ نے اُردو شاعری کی کلاسیکی روایت کی پیروی چھوڑ کر اپنی شاعری میں شخصیت اور انفرادیت کے اظہار پر زور دیا ہے اس اعتبار سے غالب کو اُردو کا پہلا "رومانی شاعر" کہنا چاہیے۔ رومانیت کی سب سے نمایاں اور امتیازی خصوصیت انفرادیت کا بے

پایاں احساس ہے جو قدم قدم پر اپنا اثبات چاہتا ہے۔لہٰذا وہ اپنے انہی تجربات کی ترجمانی میں مصروف رہے جو ان کی ذات سے متعلق تھے......!کلاسیکیت میں تجربات کی قدر و قیمت، جماعت کے احساس اقدار سے وابستہ ہے اور رومانیت میں خود فرد کی ذات سے۔چنانچہ غالبؔ نے خود کو صرف انہی مضامین کے بیان میں محدود نہیں رکھا۔جو شعری روایات کے ذخیرے میں مستند اور سکہ بند تصور کیے جاتے تھے بلکہ انہوں نے سب کے جانے پہچانے، عام فہم تجربات ہی کو اظہار کے نئے پیراہن پہنانے پر اکتفا نہیں کیا۔نئی اور منفرد بات، نئے اور منفرد انداز میں کہنے کی کوشش کی ہے۔انہوں نے فکر و احساس کی نادیدہ زمینوں کو دریافت کیا ہے اور ان میں لہلہاتی فصلوں کی رنگا رنگ جھلکیاں دکھائی ہیں ،یہی ان کے طبعی رجحانات کا تقاضا تھا......

غالبؔ کی اس امتیازی شان کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب آپ اُردو کے قدیم شعراء کا کلام پڑھتے پڑھتے ایک دم غالبؔ کا کلام پڑھ لیں گے۔آپ خود کو ایسی دنیا میں پائیں گے جہاں غالبؔ نے انوکھے رنگ تخیل اور نرالی طرز فکر سے تجربات اور معانی کی ایک مختلف دنیا آباد کر رکھی ہے جو وسیع بھی ہے، متنوع بھی اور دلچسپ بھی......!!

غالبؔ کے یہاں جب تازہ و شگفتہ استعاروں، تشبیہوں اور ترکیبوں کی فراوانی نظر آتی ہے،اس میں بھی دراصل یہی انفرادی شان دکھانے کی کوشش کارفرما ہے۔ان کے تجربات ایک انفرادی خصوصیات رکھتے تھے،اس لئے انہوں نے انہیں شعر کے قالب میں ڈھالنے کے لئے بڑی نادر اور منفرد تشبیہیں، ترکیبیں اور استعارے استعمال کیے ہیں......!انہوں نے قدیم اسلوب کی مروّجہ عوام پسند اور پیش پا اُفتادہ صنعتوں سے کام نہیں لیا،ان کے انداز بیاں میں جو تازگی اور نیا پن ہے وہ ان کی انفرادیت کا عکس

ہے۔ انہوں نے اپنے مطلب کے اظہار کے لئے نئے سے نئے پیرایے تلاش کیے ہیں! ہیئت میں کسی نمایاں بتدیلی کی صورت میں نہیں بلکہ لفظوں کے اثر انگیز اور معنی خیز مرکبوں کی صورت میں۔

یہ درست ہے کہ غالب کا شعور آج کا شعور نہ تھا، اس کی بنیاد مارکس کے اصول یا فرائیڈ کی نفسیات پر نہ تھی، لیکن پھر بھی ان کے شعور میں آج کے شعور کی پرچھائیاں مل جاتی ہیں......! ان کی شاعری، نفسیاتِ محبت کی شاعری ہے......! ان سے پہلے کے شعراء تمام ترکیفیاتِ عشق سے الجھے رہے، انہوں نے شاعری کا رُخ نفسیاتِ عشق کی طرف موڑ دیا، اور اس طرح اس سماجی معنویت کے لئے میدان ہموار کیا جس پر آج ''جدید غزل'' نازاں ہے......!

اس کام کے لئے مطالعے کی گہرائی، مشاہدے کی وسعت، نظر کی درّاکی، اور مصورانہ چابکدستی کی ضرورت تھی جو قدرت کی طرف سے انہیں وافر مقدار میں عطا ہوئی تھی اس پر صاحبان علم وفضل کی صحبت، فارسی شعراء کا وسیع مطالعہ، اور ان کی اپنی ذہانت و وجودتِ طبع، سونے پر سہاگا ہوگئی......! بیدلؔ کی معنی آفرینی نے انہیں لبھایا...... کلیمؔ، آملیؔ، نظیریؔ، صائبؔ، ظہوریؔ اور عرفیؔ وغیرہ کے مطالعے نے خیال کی بلند پروازی اور شاعرانہ آرٹ سے آگہی بخشی۔ چنانچہ وہ اُردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے علم ومطالعہ کے اس وسیع پس منظر میں شاعری شروع کی اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا...... اپنی راہ خود تراشنے کا جذبہ ان کی فطرت میں تھا، لہٰذا دماغ کی کاوش کو انہوں نے غزل گوئی میں اپنا شعار بنایا......! اور اس طرح اُردو شاعری کی وہ دیوی جواب تک دل کی اتھاہ وادیوں میں بھٹک رہی تھی، دماغ کی وسیع وعریض فضاؤں سے روشناس

ہوئی......!

مشاہدے کی وسعت، خیال کی رنگارنگی معنی، آفرینی کی جستجو اور اس پر مستزاد دماغی کاوش اور خداداد ذہانت ان سب نے مل کر غالبؔ کے یہاں وہ البیلا پن اختیار کیا ہے کہ ان کا کلام نگارخانہ بن گیا ہے۔ اسلوب بیان وہ اپنایا ہے کہ ان کا ہر شعر ہر زمانے کا شعر ہو گیا ہے اور اسی کو ادب میں آفاقیت کا نام دیا گیا ہے......!

غالب نے اُردو شاعری کو صرف سوچنے کی قوت نہیں بخشی بلکہ شکستوں اور ناکامیوں سے بلند ہو کر زندگی گزارنے کا موقع دیا، بندھے ٹکے مسلّمات کے باوجود نئی طرز اختیار کرنے اور ذاتی فکر و احساس پر اعتماد کرنے کا پیام دیا...... اصداقت کے بارے میں صحت مند تلاش و جستجو کا وہ جذبہ بخشا جو قدیم سچائیوں پر قانع ہونا نہیں جانتا بلکہ اپنی شخصیت کے خلوص اور احساس کی سچائی کی متاع قلیل لے کر بازار کائنات کی ساری حقیقتوں میں کھرے کھوٹے کا پتہ لگانے کے لئے خود ہی نکلتا ہے......!!

یہی ابدی جستجو، غالب کا سب سے عظیم ورثہ ہے جس طرح وہ نئی نسل کی افسردگی، اضطراب، تشکیک اور شکست خوردگی میں شریک ہوتے، اور سہارا دیتے ہیں اس طرح اُردو کا کوئی دوسرا شاعر شریک نہیں ہوتا...... کیا اُردو ایسے شاعر کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے......؟؟

غالبؔ علیٰ کلِّ غالب:

غالبؔ نے اُردو شاعری ہی کو نیا رنگ اور آہنگ نہیں دیا بلکہ جدید اُردو نثر کی بنیاد بھی اپنے بابرکت ہاتھوں سے رکھی ہے...... ان کے خطوط میں ان کی شخصیت اور روح عصر پورے طور پر جلوہ گر ہے...... وہی شگفتگی، بلند نظری، اور تابناکی جو ان کی شاعری کی

خصوصیت ہے، یہاں بھی کارفرما ہے......جس طرح ان کی غزل، حدیثِ دلبراں سے گزر کر حدیثِ زندگی بن گئی ہے، ایسے ہی ان کے خطوں میں زندگی کا سونا پگھلتا ہوا نظر آتا ہے......!!

غالبؔ کو نظم ونثر دونوں پر قدرت حاصل تھی۔ یہ سعادت، یہ بزرگی، یہ عظمت عام نہیں ہے، سعدیؔ، ظہوریؔ اور ملٹنؔ کے علاوہ یہ مرتبہ بہت کم لوگوں کو حاصل ہو سکا ہے۔ بے شک غالبؔ کے شاعرانہ ابداعات اپنی جگہ بالکل غیر فانی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن اگر "دیوانِ غالبؔ" نہ ہوتا اور نہ صرف "خطوطِ غالبؔ" ہوتے تب بھی ان کا مرتبہ اُردو ادب میں وہی ہوتا جو آج ہے......!!

غالبؔ کے بغیر اُردو ادب وہ درخت ہے جس کا سایہ نہ ہو......!! وہ شاخ ہے جو پھلوں کی لذت سے آشنا نہ ہو...... ایسی انگوٹھی ہے جس پر نگینہ نہ ہو...... ایسا چراغ ہے جس میں تیل نہ ہو...... گوری کی وہ کلائی ہے جس میں چوڑیاں نہ ہوں...... رقاصہ کی وہ تھرکتے ہوئے پیر ہیں جن میں گھنگھرو نہ ہو......! اماوس کی وہ کالی رات ہے جس میں چاند نہ ہو...... ایسی اُجڑی ہوئی بیوہ ہے جس کا تازہ عروس شوہر اس کی نظروں کے سامنے بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہو...... غالبؔ کے بغیر اُردو ادب ایسا شخص ہے جس کی آبرو نہ ہو...... لہٰذا غالبؔ خستہ کے بغیر اُردو ادب کا تصور ممکن ہی نہیں ہے......!!

غالب کو اُردو سے وہی نسبت ہے جو باغ کو بہار سے، گُل کو بُو سے، جسم کو روح سے، مکان کو مکین سے، بیان کو ندرت سے، کلام کو فصاحت سے، الفاظ کو معانی سے، دماغ کو فکر سے، اور لازم کو ملزوم سے، لفظ "اُردو ادب" غالبؔ کے بغیر نامانوس معلوم ہوتا ہے...... اِدھر ذہن میں "اُردو ادب" آیا اور اُدھر غالب کا نام زباں پر آیا......!! حالانکہ

لاتعداد شاعر و ادیب ہو گزرے ہیں اور آج بھی ہیں لیکن غالب آج بھی غالب علیٰ کل غالب ہیں......!!

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا......!!
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے......!!

کتابیات

۱۔ قرآن مجید

۲۔ نہج البلاغہ

۳۔ دیوان غالب

۴۔ تنقید غالب کے سو سال، سید فیاض محمد، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۶۹ء

۵۔ تلاش غالب، نثار احمد فاروقی، کتابیات لاہور، ۱۹۶۹ء

۶۔ مطالعۂ غالب، مرزا جعفر علی خان اثر لکھنوی، دانش محل لکھنؤ ۱۹۵۲ء

۷۔ غالب، غلام رسول مہر، شیخ مبارک علی لاہور ۱۹۳۶ء

۸۔ افادات غالب، سید وزیر الحسن عابدی، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۶۹ء

۹۔ غالب ذاتی تاثرات کے آئینے میں۔ سجاد باقر رضوی، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۶۹ء

۱۰۔ غالب شاعر امروز و فردا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اظہار سنز لاہور، ۱۹۷۰ء

۱۱۔ اشاریہ غالب، سید معین الرحمان، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۶۹ء

۱۲۔ محاسن الفاظ غالب، نذیر احمد، ادارۂ فروغ اُردو، لاہور، ۱۹۶۹ء

۱۳۔ خطوط غالب، غلام رسول مہر، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۶۹ء

۱۴۔ تاریخ ادب اُردو، رام بابو سکسینہ، اُردو بازار لاہور ۱۹۹۱ء

۱۵۔ اُردو ادب کی مختصر تاریخ، ڈاکٹر انور سدید، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد

۱۶۔ نقوش غالب ۱ محمد طفیل، ادارہ فروغ اُردو لاہور ۱۹۶۹ء

۱۷۔ نقوش غالب ۲ محمد طفیل، ادارۂ فروغ اُردو لاہور ۱۹۶۹ء

۱۸۔ نقوش غالب ۳ محمد طفیل، ادارۂ فروغ اُردو لاہور ۱۹۷۱ء

۱۹۔ افکار غالب نمبر، صہبا لکھنوی، مکتبہ افکار کراچی، ۱۹۶۶ء

۲۰۔ ماہ نو، شان الحق حقی، ادارہ مطبوعات کراچی، ۱۹۶۹ء

۲۱۔ پیام عمل، محمد جعفر زیدی، امامیہ مشن لاہور، ۱۹۷۳ء

۲۲۔ قرآن مجید کے فنی محاسن، سید قطب شہید فیصل اسلامک ریسرچ سینٹر فیصل آباد ۱۹۸۳ء

مطبوعات محمدی

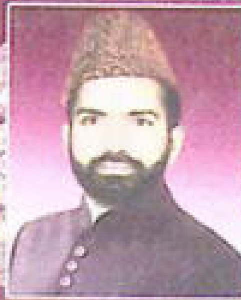


مولانا

محمد شبیہ الحسنین محمدی

فاؤنڈیشن (پاکستان)

Website: www.muhammadifoundation.com
E-mail: msmf1pakistan@gmail.com



مؤلف کا تعارف

[illegible]

تعلیمی ادارے:

[illegible]

اساتذہ:

[illegible]

تعلیمی اسناد:

مولوی فاضل، سلطان الافاضل، ایم اے اسلامیات

(ایم اے اردو)

مشغلہ:

[illegible] ۱۹۸۳ء [illegible]

تاریخ وفات: [illegible]

مدفن: [illegible]